خزینۂ اردو

KHAZINA-I-URDU

For the 3rd Form in Schools in the Hyderabad State



Allahabad:

PRINTED AND PUBLISHED BY THE

Anwar Ahmadi Press.

1922.

سلسلۂ آصفیہ کا تیسرا انتخاب

خزینۂ اُردو

مؤلفہ

جناب مولوی حافظ سید جلال الدین احمد جعفری زینبی

ہیڈ مولوی گورنمنٹ ہائی اسکول الہ آباد

جسکو

نصاب کمیٹی حیدرآباد دکن نے تھرڈ فارم کے لئے تجویز فرمایا

سنہ ۱۹۲۳ء

منشی محمد اسمٰعیل منیجر مطبع کے

اہتمام سے

مطبع انوار احمدی واقع الہ آباد میں طبع ہوا

بار اوّل ۲۵۰۰ قیمت فی جلد ۱۳ ۱-

فہرست مضامین

نثر

معزز مدرسین

میں نے اس سے پہلے بہت سے انتخابات تیار کئے جو اکثر صوبوں میں پسند آئے۔ اور اسکولوں کے نصاب تعلیم میں داخل کئے گئے۔ مگر حال میں میں نے اُردو انتخابات کا ایک سلسلہ تیار کیا ہے جس میں اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے کہ ایک کے پڑھنے کے بعد دوسرے انتخاب کے پڑھنے کی استعداد پیدا ہو اور ایک سے ایک مشکل ہو تاکہ طلباء کی استعداد میں خاص ترقی ہوتی رہے۔ اور اسکول کی تعلیم ختم کر لینے کے بعد اُردو زبان کا صحیح طور پر لکھنا۔ پڑھنا۔ بولنا۔ سمجھنا آجائے۔

مگر جب تک آپ لوگ خاص دلچسپی سے طلباء کو نہ پڑھائیں گے۔ اس وقت تک اُن کی پوری توجہ اس طرف نہ ہوگی اور کامل استعداد پیدا ہونے کی اُمید نہیں کیجاسکتی اس لئے میں آپ لوگوں کی خدمت میں حسب ذیل التماس کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ میرا یہ التماس ناگوارِ خاطر نہ ہوگا۔ اور اُسکی پابندی کے ساتھ آپ لوگ طلباء کو تعلیم دیں گے۔ تاکہ اس انتخاب سے جو میرا اصل مقصود ہے وہ حاصل ہو اور میری محنت ٹھکانے لگے۔

۱۔ جو سبق آپ پڑھائیں پہلے خود پڑھکر طلبا کو سنائیں اور اُسمیں مدالصوت قصر الصوت۔ تغیر لہجہ کے اُصول کو مدِ نظر رکھیں۔ پھر طلبا سے اُسی طور پر پڑھوائیں اور اس کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ الفاظ صحیح پڑھیں۔ اضافات کا خیال رکھیں۔ فقروں اور جملوں کے اختتام پر طلبا بقدرِ ضرورت توقف کریں۔ رفتارِ خواندگی بہت زیادہ تیز یا بالکل سست نہ ہو۔

۲۔ تمام مشکل الفاظ اور اصطلاحات کے معانی تختۂ سیاہ پر مختصراً طلباء کو نوٹ کرا دیجئے۔ اور واضح طور پر اُن کو سمجھا دیجئے۔

۳- مرکّب الفاظ کی تشریح کیجئے- عربی اسما کی جمع اور مادّے بتلائیے-

۴- ہر فقرے اور جملے کا مطلب اور مضمون کا خلاصہ طلبا کے ذہن نشین کرائیے- اور اسکو ایسے طور پر کیجئے کہ وہ خود بھی یہ سب کچھ بخوبی کرسکیں- قوّتِ بیان اُن میں پیدا ہو جاوے-

۵- تمام اشعار کا مطلب آسان الفاظ میں اُن کو سمجھانا چاہیئے- اور اُن سے خود کہلا دینا چاہیئے-

۶- تمام تلمیحات جو اُس مضمون یا شعر سے متعلق ہوں اور مصنفوں کی مختصر سوانح عمریاں اُن کو بتلائیے-

۷- اقسام نظم و نثر سے بھی طلباء کو واقف کر دینا ایک ضروری امر ہے-

۸- اِس کتاب کے ہر مضمون کے اختتام پر چند مفید سوالات دے دیے گئے ہیں اُن سوالات کو اور اِسی طرح کے اپنی طرف سے چند سوالات طلبا سے وقتاً فوقتاً حل کرائیے- تاکہ جو مضمون پڑھیں اُسکی صرف عبارت پر نظر نہ رہے بلکہ وہ مضامین اُن کے دماغ میں جم جائیں- اور اُن کی مدد سے اونچے کلاسوں میں بخوبی مضمون نویسی کرسکیں-

۹- مراتب بالا تا امکان طلبا سے کرائیں جس لفظ- فقرے- جملے کے معنی یا خلاصۂ مضمون وغیرہ کو وہ جیسے کا کوئی طالب علم نہ کہہ سکے- اُس کو آپ بتلا دیں-

۱۰- میری آخری گذارش یہ ہے کہ آپ لوگوں کو ایسی توجہ سے پڑھانا چاہیئے کہ طلبا کو اچھی استعداد پیدا ہو جائے اور اُن کو کورس کی کسی بات کے معلوم کرنے کے لئے شرح کی ضرورت نہ ہو- جس پر بھروسہ کر لینے سے طلبا آپ کی تعلیم سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے- وما علینا الا البلاغ-

ناچیز
مؤلف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو زبان کی حقیقت

فارسی اور ترکی زبان میں اُردو لشکر کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ زبان لشکری اہل حضوری و ایستادگانِ پایۂ تختِ شاہی کی زبان پر جاری ہوئی۔ اس لئے اِس زبان کا نام اُردو ہوگیا۔ اور نظمِ اُردو کو ریختہ اس لئے کہتے ہیں کہ معماروں کی اصطلاح میں ریختہ اُس مصالحہ کو کہتے ہیں جسکو در و دیوار کے استحکام کے لئے چند اجزا مخلوط کرکے بناتے ہیں اور چونکہ زبانِ اُردو کی نظم میں بھی الفاظ عربی مثل اللہ۔ رسول۔ و فارسی مثل دل۔ زبان۔ و ترکی مثل چاقو۔ باورچی۔ و عبرانی مثل یوسف و ہارون۔ و یونانی مثل کیمیا و قرطاس۔ و ہندی مثل پتلا و انگل۔ و سنسکرت مثل موتی۔ وانت۔ و زبان تامل مثل اُردو بمعنی ماش۔ و زبان تلنگو مثل بڑا۔ جو کدو و ماش وغیرہ چیز دلہا سے کھانے کے لئے بناتے ہیں۔ و زبان گجرات مثل ننہا بمعنی خرد۔ و زبانِ چین مثل چینی۔ و زبان ملاق مثل گدام۔ و زبانِ امریکا مثل تمباکو کی آمیزش ہے اس لئے اس کا نام ریختہ رکھا گیا ہے۔

زبانِ اُردو روز مرّۂ شہر دہلی کو کہتے ہیں۔ اُس شہر میں اِس سے پہلے
برج بھاشا کا رواج تھا اسی زبان میں ہر شخص بات چیت کرتا تھا۔ جب
۵۸۸ھ ہجری میں سلطان شہاب الدین غوری نے ملک ہند پر چڑھائی کی
اہلِ ہند کو شکست دی۔ پتھورا کا کام تمام کیا۔ تمام مُلک ہند سلاطینِ غور کے
قبضۂ اقتدار میں آیا۔ رفتہ رفتہ زبانِ قدیم میں لفظِ فارسی عربی۔ ترکی ملتا گیا
اُس عہد میں حضرت امیر خسرو دہلوی نے بہت سے اشعار فارسی
ہندی آمیز کہے ہیں۔

جب محمد شاہ بن تغلق شاہ سریر آرائے سلطنت ہوتے ظلم وستم
میں اُن کا شہرہ ہوا۔ باشندگانِ دہلی پر ایک تازہ ظلم کیا کہ اُن کو شہر میں
رہنے نہ دیا۔ دیوگیر معروف بہ دولت آباد میں بھیج دیا۔ اور پھر اپنی سلطنت کے
زوال سے پہلے اُن کو شہر دہلی میں بلوا لیا۔ اِس نقل و حرکت کے باعث
بہت سے الفاظ دکھنی بھی زبانِ دہلی میں مل گئے۔ زبان میں ایک نقص
پیدا ہوا۔ اور وہی اندازِ گفتگو آخر عہد جہانگیر شاہ تک رہا۔

جب شاہ جہاں بادشاہ نے ۱۰۴۸ھ ہجری میں شاہ جہاں آباد کو آباد
کیا اور شہر قدیم کہ پہلوئے مغرب میں تھا معطل ہو کر ملقب بشہر کہنہ و قلعہ
کہنہ ہوا شاہ جہاں آباد میں اطراف و جوانب عالم سے ہر قسم کے ذی علم
اور صاحبِ استعداد اور قابل لوگ آکر مجتمع ہوئے قدیم ہندی متروک ہونے
لگی۔ محاورے میں فرق آنے لگا۔ زبانِ اُردو کی ترقی شروع ہوئی پھر
بھی دکھنی لفظوں کا استعمال رہا کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ جو لوگ سلاطین
کے ہم رکاب ممالک دکن کو جاتے تھے۔ شعرائے دکن کے اشعار لاتے
تھے اور پھر وہ اشعار مطبوع طبع باشندگانِ شاہجہان آباد ہوتے تھے۔ اسی طرح

الفاظ دکھنی رواج پاتے تھے - اس عہد میں دکن میں احسن - احمد - اشرف
جعفر سالک سعدی فضلی لطفی محمود ہاشم ہاتفی وغیرہ بہت سے شعراء موجود
تھے - مگر ان سبھوں میں محمد ولی ولی سرآمد اقران و امثال تھا - بلکہ اپنے
عہد میں شعرگوئی میں بے مثال تھا - اسکے شعر میں نوعی غزلیت بھی ہے اور
دوسروں کے بہ نسبت اسکے کلام میں فصاحت و بلاغت بھی ہے - اشعار ولی

مرا دل مجھ سے کر کے بے وفائی — پسند خاطر خوباں ہوا ہے
سن اے ولی رہنے کو دنیا میں مقام عاشق — کوچۂ زلف ہے یا گوشۂ تنہائی ہے
اک دل نہیں آرزو سے خالی — ہر جا ہے محال اگر خلا ہے

یہ شخص عالمگیر کے عہد میں اورنگ آباد سے دار الخلافت میں آیا تھا اور
اسی عہد سے شاہجہان آباد میں اردو شعر کہنے کا رواج ہوا - اور بیشتر
صاحب علم اور موزوں طبعوں نے اس زبان میں شعر کہا ہے -

محمد شاہ بادشاہ کے اوائل عہد یعنی سنہ ۱۱۳۰ ہجری میں جب دیوان ولی دکن
سے شاہجہان آباد میں آیا اسکی شہرت ہوئی سبھوں نے دیکھا اس وقت سے
شعر ہندی کا رواج بہ نسبت سابق بہت زیادہ ہو گیا - اس عہد کے سخنوران
نامی و نکتہ پروران گرامی میں نجم الدین آبرو شرف الدین علی خاں پیام
شیخ ظہور الدین حاتم - جعفر علی خاں ترکی - محمد شاکر ناجی ہیں لیکن ان
سبھوں میں افصح شیخ ظہور الدین حاتم تھے - ان کے بہت سے نامی
شاگرد ہوے سب میں ممتاز مرزا رفیع سودا تھے قصیدہ خوب کہتے ہیں
ان کے وقت تک محاورۂ قدیم کو کسی نے ترک نہیں کیا -

مرزا مظہر جان جاناں نے زبان قدیم کی اصلاح کی اور تتبع زبان
فارسی زبان ریختہ کو الفاظ غیر مانوس سے خالی کیا - اور ترکیب خوب و بندش

مرغوب سے نیا جلوہ دکھلایا۔ اور خواجہ میر درد۔ اور میر محمد تقی میر اور مرزا رفیع سودا نے بھی کسی قدر آرایش و پیرایش دے کر زبان قدیم میں وہ اثر کیا کہ ایک طرز جدید پیدا ہوا۔ اور اسی زبان میں جرأت۔ مصحفی۔ انشا۔ میر حسن نصیر دہلوی وغیرہ شعرائے دہلی و لکھنؤ شریک ہوئے۔ انھیں دنوں میں الفاظ لاطینی مثل کپتان۔ و پرتگیزی مثل نیلام و کمرا و پاؤ یعنی نان پاؤ و الفاظ فرانسیسی مثل فرامین و الفاظ انگریزی مثل بگی۔ گلاس کلاک وغیرہ بھی زبان اردو میں داخل ہو گئے۔

جب زمانہ حکیم مومن خاں مومن۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب۔ شیخ امام بخش ناسخ۔ خواجہ حیدر علی آتش کا آیا۔ ان لوگوں نے زبان اردو کے مذاق کو خوب صاف کیا اور فصاحت و بلاغت سے بھر دیا اور بہت سے غیر فصیح الفاظ کو استعمال سے خارج کر کے اس زبان کا رتبہ ایسا بڑھا دیا کہ اشعار اردو کو اشعار فارسی کے ہم پہلو کر کے دکھا دیا۔ لیکن اس عہد میں دہلی کے بہت سے متروک الفاظ و ترکیب کو شعرائے لکھنؤ نے جائز رکھا۔ اور بہت سے الفاظ و ترکیب کو جو شعرائے دہلی کے نزدیک درست تھے شعرائے لکھنؤ نے ترک کر دیا۔

محمد شاہ کے زمانے سے پہلے نثر اردو کا رواج نہ تھا۔ سنہ ۱۱۴۴ھ میں فضلی تخلص ایک بزرگ نے دہ مجلس لکھی غالباً نثر اردو کی یہی پہلی تصنیف ہے اس کے بعد مرزا رفیع سودا نے میر محمد تقی میر کی مثنوی شعلۂ عشق کو نثر میں لکھا ہے۔ اس کے بعد میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے چہار درویش کا قصہ اردو میں لکھکر نو طرز مرصع نام رکھا۔ یہ کتاب شجاع الدولہ کے عہد میں شروع ہوئی اور نواب آصف الدولہ کے عہد میں سنہ ۱۲۲۳ھ میں ختم ہوئی۔

انگریزی عہد میں سنہ ۱۲۱۵ھ میں میر شیر علی افسوس نے باغ اُردو اور سنہ ۱۲۲۰ھ میں آرایش محفل لکھی۔ اور میر امّن دہلوی نے اُسی زمانے میں باغ و بہار آراستہ کیا۔ اخلاق محسنی کا ترجمہ کیا۔ سنہ ۱۲۲۰ھ میں مولوی شاہ عبد القادر صاحب نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ بعد اس کے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب شہید نے بعض رسالے عام اہل اسلام کی فہمایش کے لئے لکھے۔

سنہ ۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اُردو میں ہونے شروع ہوئے۔ چند سال کے بعد کل دفتروں میں اُردو زبان ہو گئی۔ اسی سنہ میں اخبار کو آزادی حاصل ہوئی۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں اُردو کا اخبار دہلی میں جاری ہوا جسکے اڈیٹر مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر دہلوی تھے۔

جب گورنمنٹ انگلشیہ نے دیکھا کہ اُردو روز افزوں ترقی کر رہی ہے تو یہ مناسب سمجھا کہ اس ملک کے لوگوں کو انھیں کی زبان میں انگریزی علوم و فنون سکھائے جائیں چنانچہ سنہ ۱۸۴۳ء سے دہلی میں سوسائٹی قائم رکھکر ترجمے ہونے لگے۔ اُسی وقت سے اس زبان کو بے حد ترقی ہوئی۔

سوالات

۱- اُردو کے معنی اور اس زبان کی وجہ تسمیہ بیان کرو۔ ؟

۲- نظم اُردو کو ریختہ کہنے کا کیا سبب ہے۔ ؟

۳- اُردو زبان میں کن زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں بذریعۂ امثال تحریر کرو۔ ؟

۴- زبان اُردو کہاں کی زبان ہے۔ کب سے رواج پذیر ہوئی۔ ؟

۵- دکھنی الفاظ اُردو میں کیوں شامل ہوئے۔ ؟

۶- دہلی میں جب اُردو کی ترقی ہوئی تب دکھنی الفاظ اس میں قائم رہجانے کی کیا وجہ ہے۔ ؟

۷- دکھن کے قدیم اُردو شعرا کے چند تخلص بتاؤ۔ اور اُن میں سے ولی کے معتقد شعرا بھی تحریر کرو اور اُس کی سوانح عمری بیان کرو۔ ؟

۸- محاورات قدیم اُردو میں کس زمانے تک قائم رہے۔ ؟

۹- میرزا سودا نے اُردو میں کیا جدت کی-؟
۱۰- یورپ کی زبانوں کے الفاظ کس زمانے میں اُردو میں داخل ہوئے؟
۱۱- کس زمانے میں کن کن شعرا نے اُردو میں فارسی کی طرح فصاحت و بلاغت پیدا کر دی-؟
۱۲- نثر اُردو کا رواج کب سے شروع ہوا اور سب سے پہلے نثر کتاب کونسی تصنیف ہوئی-؟
۱۳- باغ اُردو اور آرائش محفل اور باغ و بہار، و ترجمۂ اخلاق محسنی قرآنِ مجید کا ترجمہ کن کن لوگوں نے کیا ہے-؟
۱۴- دفاترِ سرکاری کب سے اُردو میں ہو گئے-؟
۱۵- سوسائٹی ترجمہ کب کہاں اور کیوں قائم ہوئی-؟

تربیتِ اطفال

اگر ہم اس بات پر خیال کریں کہ انسانوں کے عیوب مثل کالے بادلوں کے جمع ہو کر ہم پر برستے ہیں تو دنیا سے انسانوں کے عیوب بہت ہی کم ہو جائیں- اور اگر ہم مرے ہوئے لوگوں کی آوازوں پر کان دھریں اور سمجھیں کہ وہ قبروں میں پڑے ہوئے زبانِ حال سے کیا کہہ رہے ہیں- تو شاید ایک بھی بُرائی دنیا میں نہ رہے- مگر افسوس کہ ہماری آنکھیں اندھی اور ہمارے کان بہرے ہیں-

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جب وقت گذر جاتا ہے تو بہت سی باتوں کا پچھتاوا آتا ہے کہ افسوس ہم نے یہ نہ کیا اور وہ نہ کیا اور اُس وقت پچھتانے سے کیا ہوتا ہے- کیونکہ- "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" اور لا علاج رنج کا نہایت ہی جانکاہ رنج ہوتا ہے- پس اگر ہم ایسے سخت رنج سے بچنا چاہیں تو اسکا علاج صرف یہی ہے کہ موجودہ وقت کو غنیمت جانیں-

یہ بات جو ہم نے کہی ٹھیک ٹھیک انسان کی طفولیت کی حالت سے نہایت ہی مناسبت رکھتی ہے اِس لئے جو عمر اور وقت تربیت کا ہے جب

وہ گذر جاتا ہے تو بجز لا علاج رنج رہ جانے کے اور کچھ نہیں ہوتا اور پھر اُن کا نا تربیت یافتہ رہنا مثل کالی گھٹا کے ہم پر کڑکتا ہے اور ہم پر برستا ہے اور کسی کے گھر کو بہا دیتا ہے اور کسی کے خاندان کو جلا دیتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی تمام چیزوں میں قدرتی تبادلہ ہوتا رہتا ہے اور بجز انسان کے ایسی اور کوئی چیز نہیں ہے جس کو اس تبادلے میں کچھ دخل ہو اگرچہ انسان کو کسی چیز کے پیدا کرنے کی طاقت نہیں ہے مگر اسمیں اتنی قدرت ہے کہ بہت سی چیزوں کو اپنے اختیار اور قابو میں کرکے اس قدرتی تبادلے میں شریک ہو۔ انسان ہی ایک ایسا وجود ہے جو تھوڑا بہت کارخانۂ قدرت کے بگاڑنے یا سنوارنے میں دخل رکھتا ہے وہی ایسا ذی عقل اور ذی شعور مخلوق ہے کہ دنیا کی آیندہ رفتار کو روک سکتا ہے یا ترقی دے سکتا ہے یا ابتر و خراب حالت میں ڈال سکتا ہے۔

یہ اقتدار اُس ناکامل اور فانی وجود کا جیسا کہ لڑکوں کی تربیت نا تربیت رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے اور ایسا کسی چیز سے ظاہر نہیں ہوتا۔ جب کہ ہم لڑکوں کی حالت پر غور کرتے ہیں۔ اور اُن کی بھولی بھولی اور سیدھی سادی طبیعتوں کو ہر ایک قسم کے گناہ سے پاک پاتے ہیں اور ہر قسم کی تربیت کی استعداد اُن میں دیکھتے ہیں تو ہم کو خدا کی قدرت کا کامل نمونہ دکھائی دیتا ہے اور یقین ہوتا ہے کہ وہ اُس ذات کامل کی دلی بخشش کی ہوئی چیزیں ہیں اُسکے بعد وہ ایک زمانے تک ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔ ہمارے سامنے اُن کی عقل اور فہم کی ترقی ہوتی ہے اور ہماری تعلیم و تربیت ان میں اثر کرتی ہے اور یا تو اچھی اچھی مثالوں کے دیکھنے سے اُن میں عمدہ عمدہ عادتیں اور خصلتیں بیٹھ جاتی ہیں اور یا بُری بُری نظیروں کے دیکھنے سے شروع ہی سے

اُن میں بد عادتیں اور خراب خصلتیں پڑ جاتی ہیں پھر لڑکپن کا موسم نکل جاتا ہے اور جو کچھ لڑکوں نے ہماری صحبت اور تربیت سے نیک یا بد حاصل کیا ہو اُس کا اثر دنیا میں رہ جاتا ہے۔

لڑکپن کے زمانے میں جو عمر کہ سات برس سے پندرہ برس تک ہے وہی ایسا زمانۂ زندگی ہے جس میں آیندہ کی بہبودی کے لئے زیادہ تر کوشش ہو سکتی ہے اُس زمانے میں لڑکوں کا دل ہر چیز کا مشتاق رہتا ہے حافظہ تیز ہوتا ہے قوت خوب مضبوط ہوتی ہے۔ اچھی عادتوں کا دیکھنا اور عمدہ عمدہ نظیروں سے تربیت پانا جسکو ہم نیک صحبت کہتے ہیں۔ نہایت ہی مؤثر ہوتا ہے۔ یہ زمانہ لڑکوں کے لئے ذہنی و عقلی اور اخلاقی تخم ریزی کا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت کی تعلیم کو دل نہایت جلد قبول کرتا ہے اور اُس کے تخم کو جس میں آیندہ نہایت عمدہ عمدہ پھل پھول پیدا ہوں گے بہت جلد اُگا دیتا ہے لیکن اگر اُس زمانے میں تربیت نہیں ہوتی تو پھر بہت ہی کم فائدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں عادت میں مضبوطی آتی جاتی ہے یہاں تک کہ آخر کار عادت طبیعت سے مل جاتی ہے اور طبیعت ثانی کہلاتی ہے جسکا بدلنا نہایت ہی دشوار ہو جاتا ہے۔

ایک نہایت لائق شخص کا حکیمانہ قول ہے کہ "لڑکپن کی طبیعت کتنی بڑی اہم امر ہے کہ آیندہ کی بھلائی یا برائی اُس کے احتیاط و غیر احتیاط پر منحصر ہے جو لڑکوں کے مربیوں کی طرف سے ہوتی ہے" پس جو لوگ قومی ترقی کے خواہاں ہیں اُن کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ لڑکوں کی تربیت کے لئے عمدہ انتظام کریں جس سے ہمکو آیندہ کی بہبودی کی توقع ہے ورنہ ہم پر یہی مثل صادق آویگی کہ "میاں کہیں بوڑھے طوطے بھی پڑھے ہیں"۔ (سر سید)

سوالات

۱- دنیا سے انسانوں کے عیوب کیونکر بہت ہی کم ہو سکتے ہیں اور کیونکر برائی دنیا سے یک قلم موقوف ہو سکتی ہے۔!

۲- موجودہ وقت کو غنیمت جاننے کا کیا نتیجہ ہے۔؟

۳- تربیت کا وقت گذر جانے سے کیا کیا نقصانات ہوتے ہیں۔؟

۴- ثابت کرو کہ انسان ایسا وجود ہے جو تھوڑا بہت کارخانۂ قدرت کے بگاڑنے یا سنوارنے میں دخل رکھتا ہے۔؟

۵- لڑکوں کی عمر کا وہ کونسا زمانہ ہے جس پر آئندہ کی بہتری اور بہبودی کا انحصار ہے اور کیوں۔؟

۶- لڑکوں کی تربیت کے لئے عمدہ انتظام کون لوگ کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔؟

تعلیم

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی رُوح بغیر تعلیم کے ایسی ہے جیسے سنگِ مرمر کے پہاڑ کے مانند ہے کہ جب تک سنگ تراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا اُس کا ڈھنڈلا اور کھُردراپن دُور نہیں کرتا۔ اُسکو خراش تراش کر سُڈول نہیں بناتا اُس کو پالش اور جلا سے آراستہ نہیں کرتا اُس وقت تک اُس کے جواہر اُسی میں چھپے رہتے ہیں اور اُسکی خوشنما سین اور دلربا رنگتیں اور خوبصورت خوشنما بیل بوٹے ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی حال انسان کی رُوح کا ہے انسان کا دل کیسا ہی نیک ہو مگر جب تک اُس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا اُس وقت تک ہر ایک نیکی اور ہر ایک قسم کے کمال کی خوبیاں جو اُس میں چھپی ہوئی ہیں اور بغیر اُس قسم کی مدد کے نمود نہیں ہو سکتیں ظاہر نہیں ہوتیں۔

ارسطو نے تعلیم کے اثر کو مجسّم مورتوں کے بنانے کی تشبیہ میں نہایت

خوبصورتی سے بیان کیا ہے وہ کہتا ہے کہ موہنی مورت ایک پتھر کے ڈھوکے میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ مگر مورت بنانے کا ہنر صرف فضول چیزوں کو اُس میں گھڑ دیتا ہے۔ مورت تو پتھر ہی میں ہوتی ہے مگر آذر صرف اُسکو نمود کردیتا ہے۔ جو نسبت صورت گھڑنے والے کو اُس پتھر کے ڈھوکے سے ہے وہی نسبت تعلیم کو انسان کی رُوح سے ہے۔ بڑے بڑے حکیم اور عالم۔ ولی۔ و ابدال۔ نیک و عقلمند۔ بہادر۔ و نامور۔ ایک گنوار آدمی کی صورت میں چھپے ہوتے ہیں۔ مگر اُن کی یہ خوبیاں عمدہ تعلیم کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ جب میں جاہل اور وحشی قوموں کے حالات پڑھتا ہوں تو اُن نیکیوں سے جو اُن میں ہیں مگر ناشایستہ اور اُس دلیری اور جرأت سے جو اُن میں ہے مگر خوفناک اور اُس استقلال سے جو اُن میں ہے مگر بے ڈھنگا اور اُس دانائی اور عقلمندی سے جو اُن میں ہے مگر جانور کے سے مکر و فریب سے ملی ہوئی اور اُس صبر و قناعت سے جو اُن میں ہے۔ اور گویا ناامیدیاں ہی اُن کی اُمیدیں ہیں نہایت خوش ہوتا ہوں۔ سچ ہے کہ انسان کے دل کے جوش مختلف طرح پر کام کرتے ہیں اور جس قدر کم و بیش عقل کی ہدایت اُن کو ہوتی ہے اور جس قدر کہ عقل اُن جوشوں کو درست کرتی ہے اُسی قدر مختلف طور پر اُن سے کام ہوتے ہیں۔ امریکہ کے حبشی غلاموں کا جب یہ حال سُنتے ہیں کہ اپنے آقا کے مرنے پر یا ایک کام پر سے چھڑا کر دوسرے کام میں لگانے پر جنگلوں کے درختوں میں لٹک کر اپنی جان دے دیتے ہیں یا ایک ہندو عورت اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جل کر ستی ہو جاتی ہے تو کون شخص ہے جو انکی وفاداری اور محبت کی تعریف نہ کریگا گو کہ کیسے ہی ناشایستہ اور نامہذب طور سے ظاہر ہوتی ہے اس قسم

کی جاہل اور وحشی قوموں کے دلوں میں بھی نہایت عمدہ عمدہ باتیں پائی جاتی ہیں گو وہ وحشی پنے ہی کی حالت میں کیوں نہوں لیکن اگر اُنکی مناسب طور سے درستی کی جاوے تو وہی وحشیانہ نیکیاں کس قدر ترقی پاسکتی ہیں اور کیسے کیسے عمدہ کام اور مُہذّب و شایستہ نیکیاں اُن سے پیدا ہوسکتی ہیں۔

(سرسید)

سوالات

۱- مصنف نے انسان کی رُوح کو چتکبرے سنگ مرمر کے مشابہ بیان کرکے اُسکے متعلق کیا ذکر کیا ہے۔؟
۲- ارسطو نے تعلیم کے اثر کو مجسّم مُورتوں کے بنانے کی تشبیہ میں نہایت خوبصورتی سے کس طرح بیان کیا ہے۔؟
۳- امریکہ کے حبشی غلاموں کی عجیب باتیں کیا کیا سُننے میں آئی ہیں۔؟
۴- وحشیانہ نیکیاں کیونکر ترقی پاسکتی ہیں۔؟

تعلیم کی ضرورت

رعایا گورنمنٹ کی دولت ہے۔ اُس کی رضامندی گورنمنٹ کی قوّت۔ رعایا اور گورنمنٹ کے اغراض ایسے باہم گروابستہ ہیں کہ اگر رعایا اچھی رعایا اور گورنمنٹ گُڈ گورنمنٹ ہو تو رعایا ہی گورنمنٹ ہے۔ اور گورنمنٹ ہی رعایا۔ مگر افسوس بڑے افسوس۔ بڑے سخت افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بدنصیب ہندوستان کی رعایا اور گورنمنٹ میں وہ گاڑھا اتحاد نہیں ہے اور اُس کے ہونے میں ابھی بہت دیر معلوم ہوتی ہے جبکا ہونا رعایا اور گورنمنٹ دونوں کے حق میں مفید بلکہ ضروری ہے۔

برٹش گورنمنٹ کو ہندوستان میں حکومت کرتے ہوئے قرن ہوگئے بھلا پھر کونسی چیز رعایا اور گورنمنٹ میں اتحاد پیدا ہونے کی مانع ہے۔ کیا گورنمنٹ جابر اور سخت گیر ہے۔ توبہ توبہ ماں باپ سے بڑھکر شفیق۔ تو کیا رعایا سرکش

ہے۔نہیں نہیں۔ایسی منقاد۔ اس قدر مطیع کہ ایک چرواہے کو بھیڑ بکری کے ریوڑ کا روکنا مشکل اور ایک نہتے کانسٹبل کو انبوہ رعایا کا سنبھالنا آسان۔ پھر کس کا قصور ہے۔رعایا کا۔کیونکہ ناتعلیم یافتہ ہیں انکو گورنمنٹ کا منشا معلوم نہیں۔گورنمنٹ کے اصول سے آگاہی نہیں باپ دادا سے انہوں نے دیکھی ہیں شخصی خود مختاریاں۔ ان کے ذہنوں میں متوارث طور پر یہ بات مرتکز ہو رہی ہے کہ سلطنت اسی واسطے موضوع ہوئی ہے کہ حاکم وقت کی آسایش کے لئے رعایا مصیبت اٹھائے۔رعایا کمائے حاکم اڑائے رعایا اپنی انتڑیوں کو ترسائے تاکہ بادشاہ کے نوکروں کے چاکروں کے پیشکاروں کو تخمہ ہو۔ رعایا جاڑے میں سکڑے۔تاکہ شاہی اصطبل کے ٹٹو کشمیری شالوں کی گردنیاں اوڑھیں۔

پس اے حاضرین باتمکین! میں آپ صاحبوں کو صمیم قلب سے مبارکباد دیتا ہوں آپ نئے زمانے کے رنگ کو خوب سمجھا۔کوئی شخص جس کو عقل سے ذرا بھی بہرہ ہے اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ تعلیم ہی رعایائے ہند کو شایستہ اور مہذب بنائے گی۔تعلیم ہی ان کو دولت کی کیمیا سکھائے گی۔تعلیم ہی ان کی نظر میں برٹش گورنمنٹ کی قدر بڑھائے گی تعلیم ہی انکو برٹش گورنمنٹ کی برکتوں سے متمتع ہونے کی حرص دلائیگی۔تعلیم ہی بدگمان رعایا اور رکی ہوئی گورنمنٹ کے دلوں میں صفائی کرائے گی۔ اور جب وہ زمانہ آئے گا کہ رعایا اور گورنمنٹ ایک جان دو قالب ہونگے۔ تو ہندوستان کو جنت نشان کہنا حقیقتاً ہوگا نہ ایشیائی شاعری کا مبالغہ۔ اس وقت ہندوستان کی سلطنت پوری پوری مطمئن سلطنت ہوگی۔مستحکم۔ بیرونی دشمنوں سے بے خطر اور اندرونی فسادات مجاتج نارد اسے فارغ۔

(نذیر احمد دہلوی)

سوالات

۱- رعایا اور گورنمنٹ دونوں کے حق میں مفید بلکہ ضروری کیا چیز ہے-؟

۲- تعلیم کا اثر ہندوستان پر کیا پڑے گا-؟

تعلیم مروجہ میں کس چیز کی کسر ہے

اب میں اپنے خیال کے مطابق یہ بات دکھانا چاہتا ہوں کہ تعلیم مروجہ میں کس چیز کی کسر ہے- اس میں اتنی ہی کسر ہے کہ ادھوری اور ناتمام ہے- میں اس وقت کے تعلیم یافتوں کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں ان کو ہر طرح کی تحسین اور توقیر کا مستحق جانتا ہوں- اور ہر چند ساری عمر میں نے کبھی یہی پاپڑ بیلے ہیں- مگر میں صاف دل سے ان کو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہوں- میری طالب علمی کے زمانے میں تو بی- اے- اور ایم- اے- کے کچھ بکھیڑے تھے نہیں- اور خدا نے مجکو اس دردسری سے بچایا ہے کہ اپنے نام کے ساتھ کسی خطاب کا دم چھلا لگاؤں- لیکن میں اس کا معترف ہوں کہ اگر مجھ سے ایسے ایسے کڑے امتحان لئے گئے ہوتے تو میں ضرور فیل (ناکامیاب) ہوتا-

ہاں تو غرض یہ ہے کہ مجکو تعلیم مروجہ کے نقصان دکھانے منظور ہیں- تعلیم یافتوں کی اہانت مقصود نہیں- تو کوئی تعلیم یافتہ اس سے برا نہ مانے کہ میں تو آج کل کے بڑے بڑے تعلیم یافتہ کو بھی اس مثل کا مصداق سمجھتا ہوں (جیک آف آل اینڈ ماسٹر آف نن) سب کچھ جانتے ہیں اور کچھ نہیں- انسان کے دل کا حال قریب قریب اسکے معدے کا سا ہے- اگر کوئی شخص اوپر تلے اناپ شناپ کھانا ٹھونستا چلا جائے تو معدہ اس کے ہضم پر قادر

ہوگا۔ اور نہ تغذیۂ بدن کریگا۔ اسی طرح اگر کوئی طالب علم پڑھنے میں۔ طوطے کی طرح حفظ کرتا جائے (جیسا کہ آجکل ہو رہا ہے) تو یقیناً وہ اُسکو ہضم نہیں کر سکیگا اور نہیں کر سکتے۔ اور نہ ایسا پڑھنا اُسکے لئے مفید ہوگا۔ اور نہیں ہوتا۔

کسی کا اچھا مقولہ کبھی کا نظر سے گذرا ہوا یاد ہے کہ ہر چیز میں سے تھوڑا تھوڑا اور کوئی چیز ساری بھی۔

پس مجھ سے پوچھتے ہو تو تعلیم میں اس قاعدے کی حرفاً حرفاً تعمیل ہونی چاہئے۔ طریقۂ مروّجہ میں ہر چیز میں سے تھوڑا تھوڑا کا پاس تو خوب کیا جاتا ہے مگر کوئی چیز ساری بھی کا مطلق خیال نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس طریقے کے مطابق جتنے لوگوں نے تعلیم پائی اُن میں کوئی شخص کسی شعبے کا کامل فن نہوا۔ جس طرح مثلاً درخت مثمر کی رسیدگی کا ایک وقت ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اُس میں پھل نہیں آتا۔ اسی طرح درخت علم کو بے کمال رسیدگی نہیں ہوتی۔ اور نہ اُس سے کسی فائدے کی امید کی جا سکتی ہے علاوہ بر از جہل شے کے امتیاز سے دیکھو تو اونٹے سے اونٹے درجے کی تعلیم بھی خالی از منفعت نہیں۔ مثلاً گردو کاشتکاران اگر اتنا لکھنا پڑھنا اور لیکھا کرنا سیکھیں کہ پٹواری مغالطہ نہ دے اور زمیندار زیادہ ستانی نہ کر سکے تو اس سے کس کو انکار ہے کہ اتنی ہی استعدادِ علمی کاشتکار کے لئے مفید ہوگی۔ اور کون کہتا ہے کہ کاشتکاروں کو اس قدر تعلیم جس کے وہ سخت حاجتمند ہیں نہ دیجائے لیکن گفتگو اس میں ہے کہ اگر ہندوستان کو یورپ کی طرح ترقی دینا منظور ہے تو آیا ویسی ترقی اور ویسی کا کیا مذکور ہے اُسکی آدھی یا پاؤ بھی اُس تعلیم کے ذریعہ سے ہو سکے گی یا نہیں۔؟

مجھکو اسکا کامل یقین ہے کہ جب تک علوم جدیدہ کے ہر شعبے کے کامل فن

تیار نہونگے ہندوستان حقیقی نکبت سے ایک انچ کی قدر بھی تو اوپر کو نہیں ابھر سکتا - اور جب ہمارے طالب علم کامل فن کی لذتوں سے آشنا ہونگے تو سمجھیں گے - نوکری کتنی ہی بڑی کیوں نہو خسیس ترین منفعت ہے - جسکی ایک کامل فن توقع کر سکتا ہے - جو لوگ اس وقت علوم جدیدہ کے حاصل کرنے میں مصروف ہیں اُنکے بزرگ - اُنکے خیرخواہ - اُنکے اُستاد - اُن کے ممتحن بہتیری نصیحتیں اُنکو کرتے ہونگے - میں ایک اجنبی آدمی ہوں - نہ کچھ غرض نہ مطلب حسبۃً للہ ایک نصیحت میں بھی کئے دیتا ہوں یاد رکھو گے تو یاد کروگے - ؎

کسبِ کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی کس بے کمال ہیچ نیرزد عزیزِ من

تعلیم مروجہ کا ایک نقصان اور سنو وہ یہ کہ ہندوستانیوں کی طبیعتیں خلقۃً پرانی باتوں پر قائم رہنے والی واقع ہوئی ہیں یہ نقال ہیں - نہ موجد - نواحِ دہلی میں ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو ہزار برس پہلے کی عمارتیں موجود ہیں اُن پر چھکڑوں بہلوں کی تصویریں بنی ہیں وہ حال کے چھکڑوں اور بہلوں سے اس قدر اشبہ ہیں کہ گویا اُن ہی کو دیکھکر بنائے گئے ہیں - اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجودیکہ چھکڑا اور بہل روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں ہیں مگر کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا کہ اُن میں ایک کیل یا ایک کانٹا گھٹا تا بڑھاتا - پس بدون حکمت عملی کے ہرگز توقع نہیں کہ ہندوستانی آنچ کی لیں - یہ تو ایسے احدی بندے ہیں کہ لاد ہو لدا دو لادنے والا ساتھ کردو - تب تمہیں جگہ سے ہلیں تو ہلیں -

(نذیر احمد دہلوی)

سوالات

۱- مصنف نے بی - اے اور ایم - اے کے متعلق اپنے خیالات کیا ظاہر کئے ہیں - ؟

۲- تعلیم مروجہ کی نسبت مصنف کی کیا رائے ہے - ؟

۳۔ تعلیم کیسی ہونی چاہئے۔ اور انسان کو کیا سیکھنا چاہئے۔؟
۴۔ استاد کس قسم کے درکار ہیں اور کیوں۔؟
۵۔ نقال اور موجد میں کیا فرق ہے۔ اور مصنف نے اہلِ ہند کے لئے ان میں سے کونسا لقب تجویز کیا ہے اور کیوں۔؟

محنت

انسان کے چال چلن کی تربیت کے واسطے محنت ایک جزوِ اعظم ہے۔ کیونکہ اس سے اطاعت۔ بُردباری۔ مستعدی۔ توجہ اور ثابت قدمی پیدا ہوتی ہے۔ اور اپنے خاص کاروبار میں واقفیت و قابلیت اور لوازمات زندگی کے سرانجام میں لیاقت و مشاقی حاصل ہوتی ہے۔

مشغلہ ہماری ہستی کے لئے ایک لازمی امر ہے۔ جسکی پابندی سے ہم کسی طرح چھوٹ نہیں سکتے۔ اگرچہ بہت سے لوگ اوقات بسری کے واسطے یا مرلا چاری اپنے ہاتھوں سے مشقت کرنی گوارا کرتے ہیں لیکن دنیا ذی ہم لوگ قانونِ قدرت کے مطابق زندگی سے مستفید ہونا چاہتے ہیں انھیں کسی نہ کسی طرح کی محنت ضرور کرنی چاہئے۔

محنت اگرچہ ایک قسم کا تو تعب اور جبر ہے۔ لیکن یہی عزت اور شہرت کا ذریعہ ہے۔ اس کے بغیر کسی امر کی تکمیل بالکل غیر ممکن ہے۔ انسان کو جو عزّ حاصل ہوتا ہے وہ صرف محنت کے باعث ہوتا ہے اور یہ ایک درخت ہے جسکے پھل کا نام تہذیب ہے۔ پس اگر دنیا سے محنت کا نام مٹا دیا جائے تو بنی آدم میں سے اخلاقی صفت بالکل زائل ہو جائے۔ کاہلی کے کارن انسان کو طوقِ لعنت اپنے گلے میں پہننا پڑتا ہے اور یہ اس طرح آدمی کو خاک

میں ملا دیتی ہے اور بیکار کر دیتی ہے جس طرح لوہے کو مورچہ خراب کر دیتا ہے۔ جب سکندر نے فارس کو فتح کیا تو وہاں کے باشندوں کے طور طریقے دیکھکر یہ تجربہ حاصل کیا۔ کہ وہ لوگ اس امر سے بالکل واقف نہیں ہیں کہ لہو ولعب میں زندگی بسر کرنی بدترین حالت ہے۔ اور محنت و مشقت میں اوقات گزاری عمدہ ترین زندگی ہے۔

شہنشاہِ روم نے بستر موت پر اپنے سپاہیوں کو صرف یہی وصیت کی تھی کہ تم لوگ ہمیشہ محنت کے عادی رہنا۔ اور یہ محض لگاتار محنت کا سبب تھا کہ سرداران روم نے اپنی قوت و حکومت کو بہت کچھ وسیع کر لیا تھا۔

کسی شخص نے ایک دانشمند سیاح سے سوال کیا کہ آپ نے دنیا میں کسی ایسی چیز کا بھی تجربہ کیا ہے جسے ہر خاص و عام پسند کرتا ہو۔ تو اس نے جواب دیا کہ ہاں وہ کاہلی ہے جسے ہر کس و ناکس عزیز رکھتا ہے انسان میں اس امر کی کوشش کی یہ قدرتی تحریک ہوتی ہے کہ اس کو بلا وقت و محنت فوائد حاصل ہوں۔

آرام طلبی سے جس طرح شخصی نقصان ہوتا ہے اسی طرح قومی مضرت بھی متصور ہے۔ کاہلی سے دنیا میں کوئی کام ہوا اور نہ ہوگا۔ آرام طلبی سے دنیا میں ہمیشہ نقصان ہوا ہے اور ہوگا۔ قدرت کا منشاء یہ ہے کہ اس سے کسی امر میں کامیابی نہ ہو۔ کاہلی جسم و دماغ کے واسطے بالکل زہر کی خاصیت رکھتی ہے۔ اس سے صد ہا قسم کے نقصان ہوتے ہیں۔ یہی سارے عیبوں کی جڑ ہے۔ جسمانی کاہلی کے نسبت دماغی کاہلی زیادہ تر مضرت رساں ہے۔ دماغ کو بیکار رکھنا ایک ایسی بیماری ہے جس سے روحانی کاہش

ہوتی ہے۔ اور خود اُسکی موجودگی ایک عذاب ہے۔ جس طرح آب بستہ میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں اُسی طرح کاہل آدمی کے دماغ میں قبیح و مذموم خیالات بھرے رہتے ہیں۔ جسکے باعث رُوح سی لطیف شے ناپاک اور آلودہ ہو جاتی ہے۔

مَیں اِس بات کو نہایت دلیری سے کہتا ہوں کہ جو لوگ کاہل ہیں چاہے انھیں دنیا کی نعمت مل جائے لیکن وہ کبھی خوش اور سیر نہیں ہونگے اُن کے دل کی سب تمنائیں بر آئیں۔ کُل مرادیں پوری ہوں۔ اور ہر طرح کا اطمینان حاصل ہو لیکن جبتک وہ کاہل رہینگے اُس وقت تک اُن کو واقعی جسمانی ہر قسم کی تکلیف محسوس ہوگی۔ ہمیشہ مجہول افسردہ پژمردہ حزیں۔ غمگیں اور بے چین رہیں گے۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ انسان کو کبھی بیکار اور کاہل نہیں ہونا چاہیئے۔

سچی خوشیاں کاہلی سے کبھی نہیں ہوتیں۔ ہمیشہ محنت اور مشغلے ہی سے حاصل ہوتی ہیں آرام طلبی سے آدمی جس قدر تھک جاتا ہے محنت سے اس قدر نہیں تھکتا۔ کیونکہ اِس سے تو رُوح کو فرحت و مسرت حاصل ہوتی ہے گو ہر وقت مشغول رہنے سے دماغ کچھ ضعیف ہو جاتے لیکن کاہلی سے یہ بالکل ضائع و بیکار ہو جاتا ہے ایک دانشمند کا قول ہے کہ کوئی چیز ایسی مضرت رساں نہیں ہے جیسا کہ وقت کا فضول ضائع کرنا اُسی کا مقولہ ہے کہ انسان کا دل ایک چکی کے مانند ہے جس میں گیہوں ڈالا جائے تو آٹا تیار ہو۔ اور خالی چلائی جائے تو خود اُسکا نقصان ہو۔

کسی چیز کے حاصل کرنے کی خواہش کرنی اور پھر اُس کے حصول میں جو دِقتیں ہوتی ہیں اُن کو برداشت کرنا نہایت پست ہمتی ہے۔ اُسکو ہماشہ

لفظوں میں یوں سمجھنا چاہئے کہ کوئی چیز بغیر قیمت کے نہیں مل سکتی اور تو اور فرصت کا وقت بھی عمدہ طور پر صرف نہیں ہو سکتا جب تک وہ کوشش سے حاصل نہ کیا جائے کیونکہ بغیر محنت کے حاصل کیا ہوا فرصت کا وقت ایک ایسی شے ہے جسکی قیمت نہیں دی گئی۔

فرصت کی قدر اسی وقت معلوم ہوگی جب محنت کی جائیگی کیونکہ محنت کے بغیر فضول بیٹھے رہنے سے طبیعت گھبرا اُٹھے گی۔ پس ایسی فرصت سے کچھ تفریح نہیں ہوگی۔ کاہل خواہ دولتمند ہو اور خواہ غریب دونوں کی زندگی قابل نفرت ہے۔

فرانس میں ایک کاہل فقیر تھا۔ جسکی عمر چالیس برس کی تھی۔ اور آٹھویں مرتبہ قید خانے میں گیا تھا۔ اُسکے کندھے پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے جنہیں کاہلوں کا مقولہ سمجھنا چاہئے "گذشتہ زمانے سے مجھے دھوکا ہوا۔ موجودہ سے تکلیف ہے۔ اور آیندہ سے وحشت ہے"۔ پس کاہل کی عمر کے تینوں زمانوں میں سے ایک بھی آرام و اطمینان کا زمانہ نہیں۔

محنت ہر طبقے اور ہر گروہ کے لوگوں کے واسطے لازمی ہے کہ ہر شخص خواہ وہ امیر ہو خواہ غریب اپنی اپنی حالت کے مناسب الگ الگ کام اختیار کرے خاندانی اور تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ہر شخص دولتمند بھی ہو وہ تمام خلق خدا کے ساتھ نیکی کرنی اپنا فرض سمجھے۔ اپنا روپیہ اور وقت صرف کرکے لوگوں کو علم سکھائے۔ شائستہ بنائے۔ ملک کو جہالت کی آفت سے بچائے ورنہ اپنے ذاتی آرام و آسائش سے کبھی کافی اطمینان نہیں ہوگا۔

کوئی ایماندار اور عالی دماغ آدمی فضول لہو و لعب میں مصروف رہنا کبھی پسند نہیں کرسکتا۔ فضول اور بیکار بیٹھے رہنے سے نہ تو کوئی فائدہ ہو سکتا ہے اور نہ عزت۔ گو کوئی پست خیال کا آدمی اس پر قناعت کرے۔ لیکن جو

شخص عالی دماغ - ایماندار اور مستعد ہے وہ کبھی اس حالت کو سچی عزت اور اصلی وقعت کے مقابل نہیں خیال کرسکتا۔

ایک تجربہ کار کا قول ہے کہ میں کبھی یقین نہیں کرسکتا کہ بیکار آدمی کو حقیقی خوشی حاصل ہوسکے۔ ہمارے کام ہماری طرز زندگی کے مطابق ہوتے ہیں۔ تم مجھے بتاؤ کہ کون سا کام کرسکتے ہو پھر میں کہدونگا کہ تم کس قسم کے آدمی ہو۔ محنت کا شوق انسان کو خراب و ذلیل مذاق سے باز رکھتا ہے۔ دقتوں اور مشکلوں سے بچاتا ہے۔

لوگوں کا خیال ہے کہ تکلیفات اور مصائب سے نجات ہوسکتی ہے۔ لیکن تجربے سے اسکے خلاف ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ محنت و مشقت انسان کے واسطے قدرت نے مقرر کردی ہے۔ جس قدر لوگ مشکلوں کے مقابلہ کرنے سے بھاگتے ہیں اسی قدر مشکلیں ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

کم سے کم ذاتی آسایش کے واسطے کسی عمدہ شغل میں مصروف رہنا بہت ضروری ہے جو لوگ محنت نہیں کرتے وہ اسکے پھلے سے مستفید نہیں ہوسکتے۔

ایک صاحب کا قول ہے کہ خواب راحت کے بعد جب ہم بیدار ہوتے ہیں تو اسی حالت میں محفوظ رہ سکتے ہیں کہ ہم کچھ کام کریں۔ اور ہمیں اوقات فرصت اسی حالت میں آسایش دینگے جب ہم محنت سے اپنے کام انجام دیں اور فرائض پورے کریں۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اکثر لوگ حد سے زیادہ محنت کرنے کی وجہ سے مرجاتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جن کی موت کاہلی تن پرستی اور آرام طلبی کی حالت میں ہوتی ہے جو لوگ بے انتہا محنت کرنے سے مرجاتے ہیں اسکی یہ وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو باقاعدہ بسر کرنا

نہیں جانتے۔ اور جسمانی صحت کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔

یہ مقولہ ٹھیک ہے کہ کیسا ہی سخت اور مشکل کام ہو جب اصول وقواعد کے مطابق کیا جائے گا تو ممکن نہیں کہ اس سے کچھ ضرر پہونچ سکے۔ عمر کی درازی امتحان زندگی کا صحیح پیمانہ نہیں ہے بلکہ انسان کی زندگی کا اس طرح اندازہ کرنا چاہیئے کہ اُسنے اپنے خیالات میں کون سے کام کئے اور کس قسم کی واقفیت پیدا کی۔ بس دنیا میں زندہ رہکر جس قدر جس شخص نے زیادہ کام کئے۔ واقفیت حاصل کی۔ خیالات ظاہر کئے۔ سمجھنا چاہیئے کہ وہ حقیقت میں اسی قدر زندہ رہا۔ کاہل اور فضول آدمی کی عمر کتنی زیادہ ہی کیوں نہو۔ حقیقت میں بالکل عبث ہے۔

یہ بات نپولین کی عادت میں داخل تھی کہ جب وہ کوئی عمدہ دستکاری دیکھتا تو اُسکے موجد کی بہت عزت کرتا۔ کسی موقع پر وہ ایک شخص کے ساتھ سیر کر رہا تھا اتفاقاً چند مزدور بوجھ لئے ہوئے گذرے۔ اُس شخص نے غصے ہوکر مزدوروں کو ڈانٹا کہ اس طرف سے ہٹ جاؤ۔ دیپر نپولین نے کہا کہ اُنکے بوجھوں کی عزت کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان بیچاروں کی محنت عام لوگوں کے فائدوں کے لئے ہے۔ عمدہ مشاغل کی عادت جس طرح مردوں کے واسطے باعث مسرت ہے اسی طرح عورتوں کی بھی فرحت کا سبب ہے۔ اس کے بغیر عورتیں بے پروائی اور بے شغلی کی خراب حالت میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اور اسکے علاوہ جسمانی عوارض بھی اُنھیں گھیر لیتے ہیں۔ اور اعلےٰ درجے کی آسایش اُسی وقت حاصل ہوتی ہے جب کام شوق اور محنت کے ساتھ کیا جائے۔ عمدہ مشاغل کی پابندی سے صرف جسمانی راحت نہیں ہوتی۔ بلکہ دماغی فرحت بھی حاصل ہوتی ہے۔ کاہل آدمی اپنی زندگی بالکل مجبورانہ طور پر بسر کرتا ہے۔

اور اپنی خلقت کے بیش بہا جزو کو اگرچہ قطعی طور پر نہیں معدوم کرتا لیکن خواب غفلت میں ضائع کر دیتا ہے۔ مستعد آدمی ایک ایسا منبع ہے جس سے مختلف اقسام کے عمدہ مشاغل نکلتے ہیں۔ اور جہاں تک اس سے ممکن ہوتا ہے سب کاموں میں مصروف ہوتا ہے۔ کسی قسم کی معمولی محنت و مشقت بھی کاہلی کے نسبت بہت اچھی ہے

محنت کی عادت کام کرنے کا قاعدہ بتاتی ہے۔ اور وقت کی پابندی سکھاتی ہے۔ پس جب اس طرح سے عمدہ مشغلوں میں وقت صرف کرنے کی عادت ہو جائیگی تو پھر آدمی اپنا ایک لمحہ بھی بے فائدہ ضائع نہونے دیگا اور جب فرصت کا وقت آئیگا تو اسکی قدر و منزلت معلوم ہوگی۔ ایک صاحب کا قول بہت صحیح ہے کہ اگر کاہل آدمی کی نسبت یہ کہا جاوے کہ وہ وقت کا خون کرتا ہے تو باقاعدہ محنت کرنے والے کی نسبت یہ کہنا چاہئے کہ وقت میں جان ڈال دیتا ہے۔ کیونکہ اسکے افعال اس وقت بھی قائم و باقی رہیں گے۔ جب خود اسکا نشان بھی نہ رہے گا۔

باقاعدہ کام کرنے والوں کی محنت کی ایسی عادت ہوتی ہے کہ انھیں کاہلی بہت ناگوار گذرتی ہے۔ اور جب اپنے خاص کام سے فراغت حاصل کر لیتے ہیں تو انھیں دوسرے کام تلاش کرنے سے آسائش ہوتی ہے۔

محنتی آدمی اپنے اوقات فرصت کا مشغلہ بہت جلد تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسے ہر وقت فرصت حاصل کر لینے کا اختیار رہتا ہے۔ لیکن برخلاف اسکے جو لوگ کاہل ہیں ان کو کسی وقت فرصت نہیں ہوتی۔ ایک صاحب کا قول ہے کہ جو وقت کو استعمال نہیں کرتا اسے کبھی فرصت نہیں رہتی۔ لیکن جو لوگ کام کرتے ہیں اور محنت کے عادی ہوتے ہیں وہ اپنی فرصت کے گھنٹوں

میں بہت بڑے بڑے کام کر لیتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے لئے کسی کام میں مصروف رہنا بہ نسبت اسکے بہت اچھا ہے کہ وہ کاہلی اور سستی کی حالت میں پڑے رہیں۔ پس جب محنت کرنے والے آدمی کا دماغ اسکے روزانہ کام سے پریشان ہوجاتا ہے تو وہ اپنی تفریح طبع کے واسطے طبیعیات۔ زباندانی وغیرہ کے سے کسی اور امر میں مصروف ہوجاتا ہے۔ لیکن اس قسم کی تفریح طبع حاصل کرنے والے وہی لوگ ہیں جو وقت کے بہت بڑے محافظ اور دنیاوی ہوا و ہوس کے مخالف ہوتے ہیں۔

جس طرح آدمی کو جسمانی صحت قائم رکھنے کے لئے محنت کی ضرورت ہے اسی طرح دماغی قوت درست رکھنے کے لئے بھی اس سے کام لینے کی حاجت ہے۔ محنت مضر نہیں۔ ہاں حد سے زیادہ محنت کرنی باعث نقصان و ضرر ہے۔ ناامیدی کے کام اور عاجز کردینے والے افعال مضرت رساں ہوتے ہیں۔ اور ہونہار کام فرحت بخش۔ اور جب یہ عمدگی اور خوش اسلوبی سے عمل میں لائے جاتے ہیں تو اُن سے فرحت اور مسرت کے اسباب حاصل ہوجاتے ہیں۔

دماغی کام اگر اعتدال سے کیا جاوے تو اُس سے بہ نسبت کسی اور کام کے کچھ بھی پریشانی نہیں ہوتی۔ اور جب باقاعدہ عملدرآمد ہو تو اُس سے صحت جسمانی و تندرستی متصور ہے۔ صرف کھانا۔ پینا۔ سو رہنا۔ اور کاہلی میں زندگی بسر کرنا بہت بڑے مضرت اور نقصان کا باعث ہے۔ لیکن حد سے زیادہ محنت کرنا بھی بہت برا ہے۔ خاصکر اُس محنت سے بہت نقصان ہوتا ہے جس سے آدمی تھک جاتا ہے۔ کیونکہ محنت سے اس قدر تکلیف نہیں ہوتی جس قدر تھک جانے سے نقصان ہوتا ہے۔ جس طرح

بالو اور سنگریزوں کے بکثرت رگڑوں سے کسی کل کے پرزے خراب ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح ماندگی سے جسم میں ضعف و نقاہت طاری ہوجاتی ہے۔ پس حد سے زیادہ محنت کرنے اور تھک جانے کی نہایت ہوشیاری سے نگہبانی کرنی چاہئے۔ کیونکہ حد سے زیادہ دماغی محنت سخت مشکل کام ہے اور یہ فعل قدرتی طور پر مضر اور مہلک ہے۔ جو شخص دماغ سے بافراط کام لیتا ہے اسکے خیالات بھی اس طرح پریشان اور خراب ہوجاتے ہیں جس طرح کوئی پہلوان اپنی طاقت سے زیادہ داؤپیچ میں محنت کرکے اعضا وجوارح کو کمزور، سست اور بیکار کر ڈالے۔

الغرض بغیر محنت و کوشش دنیا میں کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ اور نہ عزت و شہرت حاصل ہوسکتی ہے۔ قدرت کا منشاء ہے کہ انسان دنیا میں رہ کر محنت و مشقت کرے۔ اپنے آرام و آسایش اور ناموری کے اسباب مہیا کرے۔ لیکن اسکے حصول میں اس وقت تک کامیابی بالکل غیر ممکن ہے۔ جب تک کوشش و جانفشانی نہ کی جاوے۔ محنت کے بعد اسکا ثمرہ ملتا ہے۔ تکلیف کے بعد راحت کا مزہ معلوم ہوتا ہے۔ دنیا میں جن لوگوں نے شہرت حاصل کی ہے ان کی سوانح عمری سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انھیں بڑی بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بڑی محنت و جانکاہی کے بعد یہ نعمت حاصل ہوئی ہے۔ پس دنیا میں جن لوگوں کو یہ شوق ہے کہ عزت و ناموری حاصل کریں۔ انھیں چاہئے کہ جس قاعدے اور طریقے سے یہ ممکن الحصول ہے اس سے گریز نہ کریں نہ کاہل اور بیکار بیٹھے رہیں بلکہ محنت کی پابندی اپنے اوپر لازم اور فرض سمجھیں۔

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا ثلث بار جب عقیق کیا تب نگیں ہوا

(مولوی سید مرتضیٰ از رسالہ تدبیر)

سوالات

۱۔ محنت انسان کی کس چیز کے لئے جزو اعظم ہے اور اس سے کیا کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔؟
۲۔ ثابت کرو کہ مشغلہ اور مشقت انسان کے لئے ضروری امر ہے۔!
۳۔ انسان کو شرف اور اعزاز حاصل کرنے کے کیا وسائل ہیں۔!
۴۔ محنت نہ کرنے کے نتائج تحریر کرو۔؟
۵۔ سکندر نے فتح فارس کے بعد وہاں کے باشندوں کے حالات دیکھکر کیا سبق حاصل کیا تھا۔؟
۶۔ شہنشاہ تدرس نے بستر مرگ پر اپنے سپاہیوں کو کیا وصیت کی تھی۔؟
۷۔ کاہلی کے متعلق ایک سیاح سے ایک شخص نے کیا سوال کیا تھا اور اسکا جواب کیا تھا؟۔
۸۔ آرام طلبی اور کاہلی کے نقصانات بیان کرو۔؟
۹۔ وقت کے ضائع کرنے کی بابت ایک دانشمند کا کیا مقولہ ہے۔؟
۱۰۔ ثابت کرو کہ کسی چیز کے حاصل کرنے میں جو دقت آپڑے اسکا برداشت کرنا ضروری ہے۔؟
۱۱۔ فرصت کی قدر کب ہوتی ہے۔؟
۱۲۔ کاہلی کی زندگی کیوں قابل نفرت ہے۔؟
۱۳۔ محنت ہر گروہ اور ہر طبقے کے لئے کیوں لازمی ہے۔؟
۱۴۔ عالی دماغ اور ایمان دار لوگ خالی کیوں نہیں بیٹھتے۔؟
۱۵۔ تکلیفات اور مصائب سے نجات کے متعلق لوگوں کا کیا خیال ہے اور اصلیت کیا ہے؟
۱۶۔ ذاتی آسائش کے واسطے کسی عمدہ شغل کی کیوں ضرورت ہے۔؟
۱۷۔ ثابت کرو کہ کاہلی سے مرنے والوں کی تعداد محنت سے مرنے والوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔؟
۱۸۔ درازی زندگی کے لئے وقت لیے کاموں کی تعداد کو کیوں ترجیح ہے۔؟
۱۹۔ نپولین نے بوجھ اٹھانے والوں کی عزت کیوں کی تھی۔؟
۲۰۔ محنت کی عادت کے فائدے بیان کرو۔؟
۲۱۔ محنتی آدمی اپنی فرصت کے لئے مشغلہ کیوں نکال لیتا ہے۔
۲۲۔ محنت کی ضرورت جسمانی صحت اور دماغی قوت کے لئے کیوں ضروری ہے۔!
۲۳۔ ثابت کرو کہ اعتدال کی محنت بہتر ہوتی ہے۔؟
۲۴۔ کوشش اور جانفشانی سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں؟

کمال بے محنت کے حاصل نہیں ہوتا

ہم مخلوقات میں دیکھتے ہیں کہ جو خلقت زیادہ پائدار و استوار اور دیرپا ہوتی ہے

وہ بہت سج سج پڑھکر مدتوں میں بالغ و پختہ ہوتی ہے۔ جو اچھی مضبوط لکڑیاں ہوتی ہیں اُن کے درخت بہت دیر کر بڑھتے ہیں اور جانور جو بڑی عمر کے ہوتے ہیں وہ اپنی ماں کے پیٹ میں بہت دنوں رہتے ہیں یہی حال انسان کے دل و دماغ کی اولاد کا ہے جو انشا پرداز اپنے مضامین کے لکھنے میں جلدی کرتے ہیں وہ اپنی رنگینی کے سبب پھولوں کی بہار دکھاتے ہیں اور التفات کی نظروں سے دھوپ کی طرح روشنی چمکاتے ہیں۔ مگر موسم کے بدلنے کے بعد تھوڑے دنوں میں نہ وہ بہار قائم رہتی ہے نہ چمک۔ اوّل ہی نکتہ چینی کے جھونکے میں پژمردہ ہو جاتی ہیں اور بے التفاتی کا پالا اُن کو مار جاتا ہے۔ پھر نہ کوئی اُن کو پڑھتا ہے اور نہ دیکھتا ہے۔ جب ایک مصنّف پر لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ تم برسوں تک اپنی تصنیفات پر سیکڑوں دفعہ نظرثانی کرتے ہو اور پھر اُسکے بعد ایک چھوٹی سی کتاب نکالتے ہو تو اُس نے یہ مختصر جواب دیا کہ میں ایک ایسی تصویر بناتا ہوں جو ہمیشہ قائم رہے۔

غرض جو انشا پرداز محنت نہیں کرتے اور نامور ہونے کے لئے عجلت کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے ہم جنسوں میں جواب نہیں رکھتے تو وہ کیسے خیال کرسکتے ہیں کہ اُن کے کلام پر جو بے ساختہ اُنکے منھ سے نکل گیا ہے اُس پر لوگ توجہ اور التفات کرینگے۔ اور آیندہ زمانہ میں وہ یادگار روزگار رہے گا۔ یہ سچ ہے کہ بعض آدمیوں کو خداداد استعداد ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنی ادنےٰ توجہ سے جو تصنیفات کرتے ہیں وہ اِس رتبے اور شان کی ہیں کہ کوئی دوسرا اور اُسکو برسوں محنت اور جان فشانی اور غور و مطالعہ کے بعد بھی نہیں کرسکتا اُن کا حال تو اُس

قطعۂ زمین کا سا ہوتا ہے کہ جس میں خود رُو پیداوار کی وہ طاقت ہو کہ کسی دوسری زمین میں محنت و تردد و آب پاشی کے بعد بھی نہ ہو۔ مگر ایسے آدمی شاذ و نادر ہوتے ہیں بہت سے جھوٹے مدعی اُنکی قائم مقامی کا دعوے کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہم بے محنت و مشقت کے نادر ہو جائیں گے اُن کا حال ایسے کسان کا سا ہے کہ جو اپنی زمین کو یہ سمجھے کہ وہ بغیر بوئے جوتے ایسے پھل پھول پیدا کرے گی جو دنیا میں بے نظیر ہونگے۔

زمانے میں علم کے اندر بزرگی اس وجہ سے بھی حاصل ہوجاتی ہے کہ اس میں علم کم ہو۔ پس تھوڑے علم کا عالم بھی وہاں بے نظیر ہوتا ہے کوئی اُس کے برابر نہیں ہوتا۔ جہاں روکھ نہیں وہاں ارنڈ ہی برکھش ہے پس وہ اپنے تئیں بے نظیر سمجھ کر صاحب کمال جانتے ہیں اور اُس پہ خوب اُبھرتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ صاحب کمال ہونا اور بات ہے اور جاہلوں اور نالائقوں میں علم کی وجہ سے ممتاز ہونا اور بات ہے اُن کے ذہن میں کمال کا مفہوم صحیح نہیں ہوتا۔ جو صاحب کمال کمال کے معنی جانتا ہے وہ اپنے تئیں ناقص سمجھتا ہے جب وہ اپنی تصنیفات کو کمال کے معیار پر کستا ہے تو اُسمیں نقص پاتا ہے۔ ایک شاعر بے مثال نے کہا کہ میرے شعر سب کو کامل معلوم ہوتے ہیں۔ مگر مجھے ناقص۔ ایک اور شاعر جسکے برابر دنیا میں تھوڑے ہی شاعر گذرے ہیں مرتے وقت کہتا تھا کہ حسرت میں اپنے ساتھ لئے جاتا ہوں کہ میں نے ہزار اپنی جان ماری مگر کبھی ایک شعر کامل نہ کہا گیا۔ ایک مصوّر بھی جو اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ مرتے وقت یہ افسوس کرتا تھا کہ ساری عمر میں ایک دائرہ بھی کامل نہ کھینچ سکا۔

غرض پہلے زمانے میں جیسے علم ادب میں صاحب کمال گذرے ہیں ویسے پچھلے زمانے میں نہیں گذرے اسکا سبب کچھ تو یہ تھا کہ انھوں نے صحیفۂ فطرت پڑھنے میں ایسی کوشش و محنت کی کہ کوئی بات سوا اسکے متاخرین کے لئے چھوڑی نہیں کہ وہ اُن ہی کی نقل بری بھلی کیا کریں ہمیشہ وہ ایک علم کی طرف توجہ کرتے تھے اور اُسی کے اسرار جاننے میں محنت شاقہ اُٹھاتے تھے اگر شاعر بننا چاہتے تھے تو نثر سے ہاتھ اُٹھاتے تھے اور اگر نثر میں کمال پیدا کرنا چاہتے تھے تو شعر نہیں کہتے تھے اس لئے پہلے زمانے میں بہت ہی تھوڑے ایسے انشا پرداز گذرے ہیں کہ جنکو نظم اور نثر دونوں میں کمال ہو۔ بلکہ نظم میں بھی وہ ایک قسم کی شاعری پر توجہ کرتے تھے۔ اس زمانے کی طرح پہلے زمانے میں ہفتہ وار اور ماہوار اور روزانہ اخبار نکلے تھے کہ جھٹ پٹ اُن کی تصنیفات شائع ہو جاتیں۔ اس لئے برسوں وہ اُن کے گھر میں پڑی رہتی اور اُس کی اصلاح کا موقع ان باتوں سے ہاتھ لگتا۔ دشمنوں اور دوستوں کی رائے سے نئے نئے مطالب اور خیالات معلوم ہوتے۔ جب ذہن محنت سے آرام پاتا ہے تو از سر نو پھر اُس میں تازگی اور دانائی خیالات پیدا کرنے کی پیدا ہو جاتی ہے۔ فرصت اور فراغت میں خود سوچنے سے خیالات کی درستی ہو جاتی ہے۔ غرض اُن کی تصنیفات برسوں کی محنت مشقت کا نتیجہ ہوتا تھا۔ پس جو لوگ کمال حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنی تصنیفات کو کامل بنانا تو اُن کو چاہئے کہ وہ برسوں محنت کیا کریں۔ اور طرح طرح سے اپنی تصنیفات کی جانچ پڑتال کیا کریں۔ یہ خبط خیال میں نہ جمالیا کریں کہ جو بات ہمکو رات کو سوجھتی ہے اور دن کو ہم اُسے شایع کرتے ہیں وہ صحیح اور درست ہی ہوتی ہے۔ اس طرح اُن کے خیالات بہت تاریک شائع ہوں گے اور جلد لوگوں کی

نظروں سے تصنیفات گر جائیں گی۔ فقط اُن کے دس پانچ دوست ہی اُنکی
تصنیف کی تعریف کچھ دنوں تک کریں گے اُن کی زندگی ہی میں اُن کی
تصنیفات مُردہ ہو جائیں گی۔

کمال حاصل کرنا بڑی محنت اور جانکاہی کا کام ہے۔ برسوں کی
محنت اور مشقت سے بھی حاصل ہو جائے تو بہت غنیمت ہے۔ کمال
حاصل کرنے میں بہت سہج سہج وقت اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا ہے۔ جو پھول
پتے سایے میں خشک ہوتے ہیں وہ بہت دنوں تک اپنے رنگ اور سبزی
کو قائم رکھتے ہیں۔ اور جو دھوپ اور آگ سے سکھائے جاتے ہیں وہ جلد جھلس
جاتے ہیں۔ اسی طرح تمام ذہانتوں کی تعلیم فرصت میں ہوتی ہے وہ
زیادہ دیرپا ہوتی ہیں۔ وہ وقت کی سختی اور زبردستی سے پختہ نہیں ہوتیں
بلکہ وقت اور استقلال سے۔

(۲) ایسے شخص کو کمال حاصل ہو سکتا ہے جو بے ریا دوست اور سخت
دشمن رکھتا ہے اس لئے کہ دوستوں کی نصیحت سے وہ اپنی خوبیوں پر اور
دشمنوں کی نصیحت سے اپنے عیبوں پر آگاہ ہوگا۔

(۳) ہر چیز کے اندر کامل ہونے کی لوگ قصد کرتے ہیں مگر اکثر چیزیں
ایسی ہیں کہ اُن میں کمال حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ جو کمال حاصل کرنے
کا قصد کرتے ہیں اور اُس میں بڑی محنت و جانکاہی کرتے ہیں وہ کمال کے
نزدیک بہ نسبت اُن لوگوں کے پہونچ جاتے ہیں جو اپنی کاہلی اور مایوسی
کے سبب سے کمال کا خیال اس وجہ سے چھوڑ دیتے ہیں کہ ہم اُس تک
پہونچنے کے نہیں۔

(۴) اگر تم وہ کمال حاصل کرنا چاہتے ہو جو تم میں نہیں ہے تو کبھی حاصل

موجودہ پر راضی نہ ہو اس لئے جس حالت سے تم اپنی خوش ہو جاؤ گے وہیں ٹھہر جاؤ گے۔ جہاں تم نے کہا کہ مجھے کافی کمال حاصل ہو گیا وہیں سے زوال شروع ہو جائے گا۔ ہر کمالے را زوالے کے معنی یہی ہیں کہ جہاں آدمی نے یہ سمجھا کہ بس کمال ہو گیا وہیں زوال شروع ہوا۔ ہمیشہ کچھ زیادہ کرو۔ ہمیشہ آگے بڑھو۔ ایک جگہ نہ کھڑے رہو۔ نہ اُلٹے جاؤ نہ جھکو۔ (مولوی ذکاء اللہ)

سوالات

۱۔ ثابت کرو کہ جو چیز جلد مل جاتی ہے، وہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔؟
۲۔ انشا پرداز کو ناموری حاصل کرنے کے لئے کس بات کی ضرورت ہے۔؟
۳۔ تھوڑے علم کی کہاں قدر ہوتی ہے۔؟
۴۔ پہلے زمانے کے اہل کمال آجکل کے اہل کمال سے کیوں فائق ہوا کرتے تھے۔؟
۵۔ کیسے آدمی کو کمال حاصل ہو سکتا ہے۔؟
۶۔ محنت اور جانکاہی کرنے والے لوگ کمال کو کیوں پہونچ جاتے ہیں۔؟
۷۔ موجودہ کمال پر راضی رہنے میں کیا خرابی ہے۔؟

زبانِ گویا

اے میری بلبلِ ہزار داستاں! اے میری طوطیِ شیریں زباں والے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحرِ فسوں ساز ہے جس کے سحر کا اثر نہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک افعیٔ جاں گداز ہے کہ جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو

وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کو شکار کرتی تھی اور
اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے۔ جسکے تماشے سیکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رُلانا۔ رُوٹھے کو منانا۔ اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا ہے اور کس سے سیکھا ہے؟ کہیں تیری باتیں بس کی گانٹھیں ہیں۔ اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں کہیں تو شہد ہے۔ اور کہیں حنظل۔ کہیں تو زہر ہے۔ کہیں تریاق۔

اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں۔ ہمارے ہزاروں نقصان اور ہزاروں فائدے۔ ہماری عزت ہماری ذلت ہماری نیکنامی۔ ہماری بدنامی۔ ہمارا جھوٹ۔ ہمارا سچ۔ تیری ایک ہاں اور نہیں پر موقوف ہے۔ تیری اس ہاں اور نہیں نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کا سر کٹوایا۔

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا نہیں۔ مگر طاقت نمونۂ قدرت الٰہی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائگاں نہ کھو اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور ہے۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور میں زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر۔ اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔ اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشف اسرار ہے۔ اور کہیں تیرا لقب محرم راز۔ علم ایک خزانۂ غیبی ہے۔ اور دل اس کا خزانچی

حوصلہ اُس کا قفل ہے - اور تو اُسکی کنجی - دیکھ - اُس قفل کو بے اجازت
نہ کھول اور اِس خزانے کو بے موقع نہ اُٹھا - وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے
اور تلقین و ارشاد تیرا کام - ناصح مشفق تیری صفت - اور مرشد برحق تیرا
نام - خبردار اِس نام کو عیب نہ لگانا - اور اِس فرض سے جی نہ چُرانا - ورنہ
یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائے گا - اور تیری بساط میں وہی گوشت کا
چیتھڑا رہ جائے گا - کیا تجھکو یہ امید ہے کہ تو جھوٹ بولے اور طوفان
اُٹھائے - تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے - تو فریب بھی دے
اور چغلیاں بھی کھائے - اور پھر بھی زبان کی زبان کہلائے - نہیں
ہرگز نہیں - اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبون ہے - بلکہ
سراسر زیان ہے - اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فائق ہے ورنہ
تھوک دینے کے لائق ہے - اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ
میں اور اوروں کے دل میں جگہ پائے گی ورنہ گدی سے کھینچ کر
نکالی جائے گی -

اے زبان جنہوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجا لائے - اُنھوں
نے سخت الزام اُٹھائے - اور بہت پچھتائے - کسی نے فریبی اور مکار رکھا
کسی نے گستاخ اور منہ پھٹ اُن کا نام رکھا - کسی نے ریاکار ٹھہرایا اور
کسی نے سخن ساز - کسی نے بدعہد بنایا - اور کسی نے غماز - غیبت اور بہتان
مکر اور افترا - طعن اور تشنیع - گالی اور دشنام پھکڑ اور ضلع جگت - اور
پھبتی - غرض دنیا بھر کے عیب اِن میں نکلے اور وہ سب کے سزاوار
ٹھہرے ! اے زبان یاد رکھ - ہم تیرا کہا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں
ہرگز نہ آئیں گے - ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے - اور تجھے مطلق العنان

نہ بنائیں گے۔ ہم جان پر کھیلیں گے۔ پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائیں گے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے۔

اے زبان! ہم دیکھتے ہیں۔ کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھکر محبت کے جوش میں آتا ہے۔ تو بے اختیار ہنہناتا ہے۔ اور کتا جب پیار کے مارے بیتاب ہو جاتا ہے۔ تو اپنے مالک کے سامنے دُم ہلاتا ہے۔ سبحان اللہ وہ نام کے جانور اور اُن کا ظاہر و باطن یکساں۔ ہم نام کے آدمی اور ہمارا دل میں نہیں اور زبان پر ہاں۔

الٰہی اگر ہمکو رخصتِ گفتار ہے۔ تو زبان راست گفتار دے۔ اور اگر دل پر تجھکو اختیار ہے۔ تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں۔ اور جب تیرے دربار میں آئیں۔ تو سچے بنکر آئیں۔ (حالی)

سوالات

۱۔ مصنف نے زبان کو کن کن القاب سے یاد کیا ہے۔؟
۲۔ مصنف نے زبان کی کیا کیا خوبیاں اور کیا کیا نقائص تحریر کئے ہیں؟
۳۔ زبان کی ایک "ہاں" اور ایک "نہیں" پر کیا موقوف ہے۔؟
۴۔ زبان کی صفت کا مظہر قدرتِ الٰہی ہونا ثابت کرو۔؟
۵۔ زبان کے فرائض بیان کرو۔
۶۔ اگر زبان اپنے فرائض کو اچھی طرح ادا نہ کرے تو کیا نتیجہ ہو۔؟
۷۔ زبان کے غلط استعمال کرنے والوں نے کیا کیا نقصانات اٹھائے۔؟
۸۔ مصنف نے مضمون بالا میں گھوڑے اور کتے کی مثالیں کن کاموں کے لئے دی ہیں اور اُن سے تم کیا نتیجہ اخذ کرتے ہو۔؟
۹۔ مصنف نے اس مضمون میں کیا دعا مانگی ہے۔؟

زمانۂ حال اور ماضی کی خوش بیانی کا مقابلہ

مختلف ملکوں کے آئین اور قوانین اور اُن کے باشندوں کے اوضاع

و اطوار ابتدائے آفرینش سے ہمیشہ تغیر پذیر رہے ہیں۔ آج جو ہم مرغوب ہے۔ کل وہی معیوب ہے۔ آج ہم ایک رواج کے پابند ہیں۔ کل دوسرے پر کاربند۔ خوش بیانی آج وہ نہیں جو کل تھی۔ یورپ کے ابتدائے زمانۂ تہذیب میں اسے بطور ایک فن کے تحصیل کرتے تھے اور مقرر کی قدر و قیمت فقط اسکی گویائی پر منحصر تھی۔ جمہوری ضروریات کے لحاظ سے متقدمین کی علمی استعداد حوالۂ زبان رہتی تھی۔ عام میلوں جرگاہوں شاہی دعوتوں۔ اور عبادتخانوں میں شعرائے شیریں مقال اپنے دل آویز قصیدوں۔ پر جوش جنگ ناموں۔ محرک مناجاتوں سے غضب ڈھاتے تھے۔ مورخین تک قومی میلوں کی تقریب میں جمع ہوکر وہ داد فصاحت دیتے تھے کہ یونانیوں کے دقیقہ شناس گروہ وجد میں آکر بار بار تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس خوش بیانی نے تماشاگاہوں کو زینت بخشی۔ لفظی قصوں اور خشک شاعری نے دلچسپ کلام کے لئے پہلو خالی کیا۔ اس جماعت نے فصاحت و خوش بیانی کے لباس میں اپنے فرائض کو ایسے مہذبانہ طور پر انجام دیا کہ متاخرین آج تک دنگ ہیں۔ زمانۂ سلف میں سادہ بیان فلاسفر تک اپنے خیالات کو یوں ترتیب دینے لگے۔ کہ وہ تقریر عام کا مضمون بن سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ فصاحت خیالات کا ایک معمولی لباس ہوگئی خاص غرض یہ تھی کہ بولنے والے کا خیال اس قدر موزوں ہو کہ کشش کرے۔ ایسا پختہ ہو کہ موثر ہو سکے۔ یہاں تک مضبوط ہو کہ سامعین کے حافظے میں متمکن اور جاگزین ہو جائے۔ تحریک اور ترغیب کے حوصلے اور تیز جوش سے اسپیکر کی تقریر دمبدم تازہ اور موثر ہوتی ہوئی نظر آتی تھی۔ مجمع عام کے سامنے

از سرتا پا تقریر نظر آتا سابق کے فصحا کا ایک ادنےٰ کمال تھا - ایسی حالت میں اُن کے اشارات - حرکات - و سکنات اور ترغیب کا حقیقی شوق کیونکر ممکن تھا کہ سامعین کو والہ و شیدا بنانے میں ناکام رہے - اسپیکر کے الفاظ میں ایک عجیب کشش مقناطیسی ہوتی تھی جو سامعین موافق اور مخالف معتقد و غیر معتقد سب کے دلوں کو کھینچ لیتی تھی - یہ فصاحت فقط خالی آواز نہیں تھی - یہ وہ شعلہ صفت خیال تھے جو ایک عالی دماغ اسپیکر کے دلی جوش سے نکلتے اور اُسکی طبعی لیاقت سے مزیّن ہو کر جلوہ گر ہوتے تھے - یونانیوں کے نکتہ چیں اور باریک بیں گروہوں کے سامنے عرصۂ بلاغت و میدانِ فصاحت میں قدم بازی کرنا دل لگی نہ تھا - اور یہ زمانۂ سابق کے فصحا ہی کے حوصلے تھے کہ رائے زنی کے خطرناک میدان میں آزادی جولانیٔ طبیعت دکھاتے تھے - ایسے زمانے میں ہر ایک آدمی چاہتا ہے کہ میں خوش بیان ہو جاؤں - اسکی وجہ کیا - دلوں پہ حکومت کرنا - عنانِ اختیار اپنے ہاتھ میں لانا - انعامات حاصل کرنا - خطابات و ترقیات کا مستحق کہلانا - اِسی ایک بے نظیر طاقت پر موقوف تھا - اِس زمانے میں خوش بیانی کی منزلت یہاں تک حدِ اعتدال سے متجاوز ہوئی - بجائے اِسکے کہ لوگ اُس سے مفید باتوں میں ترقی کریں - اپنے ہر ایک ارادے کے پورا کرنے کا اُسکو ذریعہ سمجھنے لگے رومانیوں کی فصاحت بھی اُسی وقت تک قابل قدر رہی جب تک اُس میں بناوٹ کو دخل نہوا - صداقت خیال کی روح ہے خیال باطل محض بیہودگی ہے - زمانۂ گذشتہ کی فصاحت یا خوش بیانی اگر کامیاب ہوتی تھی تو زیادہ تر لفاظی و لسّانی سے ہوتی تھی - زمانۂ حال کی خوش بیانی اِس سے بہت کچھ متفاوت ہے - متاخرین نے جہاں اور علوم کو مجلّےٰ کر دیا ہے -

فصاحت کو بھی مدلل اور موزوں بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ آج کل کے فصیح و بلیغ مضبوط سے مضبوط خیالات کو بھی لفاظی زیادہ گوئی اور انواع و اقسام کی جادو بیانی سے ظاہر نہیں کر سکتے۔ اِلّا اُس صورت میں کہ فی الواقع کوئی ملکی پیچیدگی کوئی لاینحل مسئلہ یا اشتعال انگیز معاملہ زیر بحث ہو۔ جس میں دل معمولی زنجیروں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ جوں جوں قانون کا احاطہ پھیلتا ہے۔ تہذیب کا میدان وسیع ہوتا ہے۔ جوں جوں خیال میں سادگی اور باقاعدگی آتی ہے توں توں فصاحت کی لیاقت و قدرت میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یقین نہیں کہ فصاحت کا دل لبھانے والا اثر زائل ہو جائے۔ تاہم آج کل کے اسپیکر کے لئے اپنے الفاظ پر قادر ہونا اور اپنے دلائل کے استحکام سے باخبر رہنا ازبس ضروری ہے۔ اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ آجکل کی فصاحت سابق کی طرح سقم پیدا نہیں کرتی۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ اسکی طاقت نے آجکل وہ دور دورے نہیں رہے جو پیشتر تھے۔

پریس نے اُس لاجواب طاقت کو کسی قدر پست کر دیا ہے۔ اس نئی ایجاد کے ذریعے انسان ایک گوشے میں تنہا بیٹھ کے اپنے خیالات کی اشاعت کر سکتا ہے۔ اس نے تنزل لیا تھا تو ترقی نظر آتی ہیں۔ مگر ذہانت کی سادگی اور سنجیدگی بالتوسط اس قدر گھٹ رہی ہے کہ اعلےٰ درجے کا انشا پرداز بولنے میں خاک اثر پیدا نہیں کرتا۔ اور جو اسپیکر ہیں وہ طباع اور حاضر جواب نہیں پائے جاتے۔ نہایت پُر مغز تحریریں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مگر ایک مجمع کے سامنے اُسی قسم کی جادو بیانی اور دُر فشانی آسان کام نہیں۔

جہاں مجمع کے روبرو کھڑے ہوئے ہوش و حواس غائب ہوئے سب تیزی طراری

متعلق۔ دلائل بالکل لاطائل۔ الفاظ ہیں کہ وبال ہوگئے۔ بولنا بلا کا سامنا قیامت کا مقابلہ ہوگیا۔ چند ہی بندگانِ خدا نظر آئیں گے۔ جو اپنے خیالات پر اس قدر قادر اور حاکم ہوں کہ بے تحاشا گفتگو کرسکیں۔ لوگ دن بدن خاموشی سے مانوس ہوتے جاتے ہیں۔ رسالجات مطبوعہ کو سب سے الگ تھلگ بیٹھکر جی بہلانے کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی تقریر ہوئی تو سامعین اُسے اُلٹا کتابی عبارت سے ملانے لگے۔ اور طرفہ یہ کہ جو بات سلف میں فصاحت کہلاتی تھی اب یاوہ گوئی سے موسوم ہوگئی۔ ہمیں اپنی ضروریات کو خیال میں لاکر اپنی فصاحت کو میزان میں تولنا چاہئیے۔ کہاں وہ فصاحت جسے جوش پرخیال کہنا روا ہے۔ قدیمی فصاحت کا مدعا ترغیب تھا۔ حال کی فصاحت کا مقصد ترغیب کے علاوہ یقین دلانا بھی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آجکل کے اسپیکر کو تعلقات کاروبار فنونِ مختلفہ اور آداب و قواعد میں بہت کچھ درک ہو۔ غرضکہ اس زمانے میں فصاحت کے ساتھ قوت مدرکہ کی معاونت ازبس ناگزیر ہے۔ زمانۂ سابق میں نیک مفید ملکی اور سچی باتوں کے رواج پرزور تھا۔ آج کل انصاف صداقت ترقی اور شرافت کا قائم رکھنا مد نظر ہے۔ لہذا اسپیکر کے لئے معاملہ فہمی اور دقیقہ رسی میں احتیاط رہنا لوازمات سے ہے۔

(منشی بیتے رام صاحب۔ اندر۔ فن تقریر)

سوالات

۱۔ خوش بیانی میں قدیم زمانے سے اب تک کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں۔؟

۲۔ کن کن جماعتوں میں خوش بیانی کا رواج وقتاً فوقتاً ہوتا رہا۔؟

۳۔ زمانۂ سلف میں سادہ بیان فلاسفر اپنے خیالات کو کس طرح ترتیب دینے لگ گئے اور اس کام سے اُن کی کیا خواہش تھی۔؟

۴۔ یونانی نکتہ چین جماعت کے سامنے قدیم فصحی نے کس طرح کی تقریریں کیں۔؟

۵- رومانیوں کی فصاحت کب تک قابل قدر رہی -؟
۶- متاخرین نے فصاحت میں کس قدر دخل دیا ہے -؟
۷- آج کل کے اسپیکر کے لئے کس کس بات کی ضرورت ہے -؟
۸- یورپ کا اثر فصاحت و بلاغت پر کیا پڑا ہے -؟
۹- آجکل کے فصحا جماعت کے روبرو کیسی تقریر کرتے ہیں -؟
۱۰- قدیم زمانے میں فصاحت کا مدعا کیا تھا اور اب کیا ہوتا ہے -؟

خوش خلقی و نیک چلنی

نامی اسپیکر ہونے کے لئے نیک چلن ہونا ایسا ہی ضروری ہے جیسے کہ آئینے کے لئے صفائی۔ بدچلن آدمی کے دل میں وہ توانائی اور آزادہ روی نہیں ہوتی جو خیالات کی پیدائش اور اُن کے اظہار کے لئے لازمی ہے جس شخص کو ہر وقت اپنے عیوب کا علم دوندے ڈالتا ہے اُسکا دلی شوق ہمیشہ پیچھے لال رہیگا۔ ہردم کی پشیمانی۔ دائمی ندامت فکر بلند کو پاس تک نہیں آنے دیتی۔ ایسا آدمی کوشش کرتا ہے کہ اخلاقی مضامین یا مذہبی فرائض پر گفتگو کرے۔ مگر ہر لفظ پر چونک اُٹھتا ہے۔ بات بات پر دل میں خفیف ہوتا ہے۔ حوصلہ و ہمّت کو پھیر فراہم کرتا ہے۔ مگر خبث باطن کو کیا کرے۔ الفنباں سے لاچار ہے۔ آخر من چہ سے سرایم و طنبورۂ من چہ سے سراید۔ کا مضمون دیکھکر خود ہی بیچارہ مُہر بلب ہو جاتا ہے۔ نیکی بذاتِ خود ایک جوہر ہے۔ اِس سے طبیعت میں ایک آزادی پیدا ہوتی ہے۔ جسے کوئی چیز نہیں پہونچتی۔ بلا خوف و خطر آزادانہ تقریر کرنے کے لئے انسان کا طبعی طور پر خوش خلق و نیک چلن ہونا ضروریات سے ہے۔ نیک آدمی خیر خواہی عوام کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ بدخواہ کا دل زمین شور سے بدتر ہے۔ جس سے

کبھی پھول پھل کی تمنا نہ رکھنی چاہئے۔ ناصفیدہ آدمی جو عیوب کی وجہ سے انگشت نما ہو کبھی بطور ایک اسپیکر کے اثر پیدا نہیں کرسکتا۔ اُدھر کسی بدچلن آدمی نے زبان کھولی۔ اِدھر سامعین کے دلوں میں اُس کے ذاتی اطوار کے خیالات تازہ ہوگئے۔ آپس میں چشمکیں ہونے لگیں یا لوگوں نے فقرے پر فقرہ چست کیا۔ کسی نے آوارہ کتا۔ کسی نے پھبتی کہی۔ چلئے اسپیکر کے ہوئے حواس غائب۔ برخلاف اسکے اگر کوئی نیک آدمی انجمن آرا ہو خواہ اُس کے الفاظ بالکل بے تکلف اُسکی تقریر بعض نقصوں سے پُر ہو لیکن فقط اسکا نیک چلن ہونا ہی بڑی بھاری سفارش ہے۔ صرف اُسکی نیکی کے خیال ہی سے سامعین کے دلوں میں اُسکی تعظیم اُسکے خیالات کی قدر اور اُسکی باتوں کی توقیر پیدا ہو جاتی ہے۔ بہرحال اسپیکر کے لئے نیک ہونا۔ اور نیک کہلانا واجب ہے۔

(منشی جیّارام صاحب۔ از رسالہ فن تقریر)

سوالات

۱۔ نئے اسپیکر کے لئے نیک چلنی کی کیوں ضرورت ہے۔؟
۲۔ نیکی کا اثر فصاحت پر کیسا پڑتا ہے۔؟
۳۔ بدچلن کی تقریر کا اثر سامعین پر کیوں بُرا پڑتا ہے۔؟
۴۔ نیک چلن کی تقریر کیوں مؤثر ہوتی ہے۔

مضمون نویسی

مضمون نویسی کوئی ایسی آسان اور سہل چیز نہیں ہے جیسا لوگ آج کل سمجھے ہوئے ہیں کہ آنکھیں بند کیں اور صفحے کے صفحے رنگ ڈالے۔ جب تک کسی فن کے قواعد سے پوری واقفیت نہ ہو اور نفس مدعا پر غور وخوض کرنے اور ترتیب کی قابلیت نہ ہو طبع آزمائی کرنا آنکھ بند کرکے راستہ چلنا ہے

اسلئے اسکے متعلق چند مختصر قواعد انتخاب کرکے لکھے جاتے ہیں۔
مضمون نویسی میں نفسِ مضمون کو دیکھا جائے کہ کس بات پر یہ مضمون لکھا جاتا ہے۔ ابتدائی حالت میں عام فہم اور گرد و پیش افتادہ مضمون منتخب کیا جائے۔ جس میں آسانی ہو۔ اور جس مضمون کو لکھنا ہو پہلے اُس کے متعلق کافی طور پر کتابوں سے مادہ دماغ میں اکٹھا کرنا چاہئے۔
مضمون میں پہلے تمہید مضمون کے مناسب لکھے اُسکے بعد نفسِ مطلب کی تشریح کرکے نتیجہ صاف طور پر نکالے۔ مضمون نویسی کا فائدہ یہ ہے کہ اُس سے معلومات بڑھتے ہیں اور واقعات کا ترتیب دینا آتا ہے۔ لارڈ بیکن کہتا ہے کہ پڑھنے سے انسان معقول ہوتا ہے اور مباحثہ سے مستعد اور لکھنے سے کامل ہو جاتا ہے۔
مضمون نویسی کے لئے لازم ہے کہ عالم فاضل مصنفوں اور لائق انشا پردازوں کی تحریرات بغور پڑھو اور غور و خوض کی عادت ڈالو۔ اور جب تک ممکن ہو احتیاط کے ساتھ لکھو۔ کیونکہ جس طرح زمین کو جتنا گہرا کھودا جائے اُسی قدر بیج کی عمدہ پرورش ہوتی ہے اور زیادہ بار آور ہوتا ہے۔ اسی طرح تحریر میں جس قدر غور سے کام لو مطالب و معانی سے پھل پھول دامنِ تلاش کو گوہرِ مقصود سے بھرتے ہیں۔
مضامین یا اخلاق پر ہوتے ہیں جیسے راستبازی۔ دیانتداری۔ قباحت وغیرہ یا علم پر جیسے عقل۔ دماغ۔ حافظہ۔ خواہش وغیرہ۔ دولت۔ تجارت یا تاریخ پر جیسے کسی کے حالات۔
عمدہ طرز تحریر کے لئے منتخب اور باموقع الفاظ ہونا چاہیئے۔ اور

ترتیب مضامین سلیقہ سے ہو۔

(موٗنث)

سوالات

۱۔ مضمون نویسی کے لئے کن کن باتوں کی ضرورت ہے۔؟

۲۔ مضمون نویسی کی تیاری کس طرح کرنی چاہئے۔؟

۳۔ مضمون کے حصے کس طرح ترتیب دیے جائیں۔؟

کتاب

اے میری سچی غمگسار۔ میری تنہائی کی مونس۔ رنج و راحت کی شریک۔ میری ادیبا۔ میری مددگار۔ میری کتاب! تیری دلداری و غمخواری پر میں نثار۔ ہر حرف تیرا غنچہ ہے اور ہر لفظ تیرا گلدستہ۔ تیری لوح و جدول سبزہ رخسار کے خط و خال سے زیادہ دلاویز ہے۔ تیرے مصحفِ رُخ کی زیارت مسرت خیز و نشاط انگیز ہے۔

تو ارشاد و ہدایت کا سرچشمہ ہے اور نیکی و پاکیزگی کا سرمایہ۔ تو علم کی کان ہے۔ اور اخلاق کی جان۔ فرع و اصل عقل و نقل کا تو خزینہ ہے اور سلف کی تحقیق و معلومات کا گنجینہ۔ تیری شعاع نے دماغ کو روشن اور عقل کو مزین کیا۔ آدم خاکی تیری بدولت اشرف المخلوقات ہوا۔ تو محرمِ راز و مخزنِ اسرار ہے۔ تو ہمارے بزرگوں کی دماغ سوزی کی بہترین یادگار ہے۔ تو مظاہرِ قدرت کا منبع ہے اور زمانے کی نیرنگی کا مرقع۔ ازل تیری ابتدا اور ابد تیری انتہا ہے۔

تو ایزد شناسی کی بسم اللہ ہے اور معرفت الٰہی کا ذریعہ۔ تو نے ذات باری کی وحدت ظاہر کی و منصفِ حقیقی کی معدلت۔ خدا پرستی

و خدا ترسی سکھائی - کارسازِ کریم کی کارسازی اور مشکلکشائی تو نے بتائی -
اسکی شانِ جلالت کی دلیل اور اسکے دریائے رحمت کی سبیل تو نے دکھائی -
دین کی قلمرو اگر تیری جاگیر ہے تو دنیا کی مملکت بھی تیرا سر بسر ہے فضائے
بسیط کا بسط - مادے کا ہیجان و حرکت - بحرِ موّاج کی روانی - کرۂ نار کی
آتش فشانی - عناصر کی تعدیل و ترکیب - عالمِ دنیا کی تکوین و ترتیب
اور موالیدِ ثلاثہ تیرا دیباچہ ہے - نسلِ انسانی کے بانی حضرت آدم و
حضرت حوّا کا بہشتی زندگی سے سیر کرنا - آب و گلِ دنیوی میں پھنسنا -
دنیا کو دین کی طرح برتنا - اور ویرانۂ جہاں کو اپنے اہل و عیال سے بسانا
تیرا مقدمہ ہے -

بنی آدم کی ابتدائی اوقات گذاری - انکی عملی زندگی تدریجی ترقی - اصلاحِ
معاشرت اشیاء کی حقیقت - قانونِ قدرت سے واقفیت تیرا ایک وزن
ہے - موجوداتِ دنیا و کائناتِ عالم پر انسانی قبضہ - تاریخ ازمنۂ سابقہ و
قرونِ مختلفہ - مصر کی دانش - ہند کی بینش - فارس کی ذی ہوشی - یونان کی
روشن دماغی - اہلِ عرب کی حکمت آموزی - دانایانِ فرنگ کی بہرہ اندوزی
تیرا ایک سبق ہے - تو علم و عمل کی حاوی - ادب و معارف کی حامل ہے - تو
ہر علم کی عامل اور ہر فن کی کامل ہے - تواریخ عالم تیرا ایک صفحہ اور
اگلی قوموں کا عروج و زوال تیرا خاکہ ہے - عروسِ دنیا کی رنگینی - زمانے
کی بوقلمونی - تیرے دم سے حُسن کی ہنگامہ آرائی - عشق کی کارفرمائی
تیرے قدم سے ہے - تیرا ہر واقعہ عبرت خیز - اور تیرا ہر فسانہ حیرت انگیز
ہے - شدّاد کے بہشت کی کیفیات - سکندرِ اعظم کی فتوحات - خضر کا آبِ حیات
تیرا دلربا فسانہ ہے - لیلیٰ و مجنوں کے جذبات - شیریں و فرہاد کے عشق کی

واردات تیرا اونٰی کرشمہ ہے۔

اصلاح تیرا کام ہے اور مفتاح تیرا نام۔ کہیں تو دوستوں کی تقریب کرتی ہے۔ کہیں دشمنوں سے بچنے کی ترکیب بتاتی ہے۔ کہیں جلبِ منفعت کا گُر سکھاتی ہے۔ اور کہیں دفعِ مضرّت کا شوق بڑھاتی ہے۔ تو ایّامِ گذشتہ کا صحیح نقشہ۔ قدما کا ہو بہو سراپا ہے۔ تو حرزِ جان۔ اور سترِ فطرت کی ترجمان ہے۔ تو یاس و ہراس میں تشفّی دیتی ہے اور عیش و نشاط میں اعتدال کی تاکید کرتی ہے۔

تو آسایشِ دو گیتی کی تفسیر اور خوابِ راحت کی تعبیر ہے۔ تو سیرِ زمین کونین و سرِ دفترِ دارین ہے۔ تو عقل و فکر کی ہیکل اور ذہن و جودت کی صیقل ہے۔ تو لڑکپن کی شفیق۔ اور جوانی کی اتالیق۔ اور بڑھاپے کی رفیق ہے۔ کوئی تیری فصاحت پر مائل اور کوئی بلاغت کا قائل ہے۔ تیرا ہر لفظ اخلاص کے پھولوں میں بسا اور تیرا ہر نقطہ عطرِ محبّت میں ڈوبا ہوا ہے۔ تیرے قدر شناس صفحۂ ہستی پر ہمیشہ رہیں گے۔ تیرے دلدادہ دامنِ فیض کو کبھی نہ چھوڑیں گے۔

اے چشمِ بصیرت کی روشنائی! شکستہ دل کی مومیائی!! میری لیلا معانی!!! تیری زلفِ گرہگیر کا میں اسیر۔ اے میری جان۔ میری ایمان! جب تک دم میں دم ہے تو میرے ساتھ ہے۔ اور مرنے کے بعد بھی تو ہی میری وسیلۂ نجات ہے۔

(میرزا عابد حسین)

سوالات

۱۔ مصنف نے کتاب کو کن کن باتوں سے یاد کیا ہے اور ہر ایک نام کی کیا کیا دلیلیں ہیں۔؟

۲۔ کتاب کے فوائد بتاؤ۔؟

ہو ثابت کرو کہ دنیا و عقبیٰ دونوں کے لئے کتاب مفید ہے۔؟

کتب کا مطالعہ

مطالعہ تنہائی و عزلت میں خوشی بخشتا ہے گفتگو و تقریر میں حُسن بیان پیدا کرتا ہے۔ معاملات کے فیصلہ کرنے اور مقدمات میں رائے دینے کی قابلیّت بڑھاتا ہے۔ پس مطالعہ سے خوشی۔ حُسنِ بیان۔ اور قابلیّت بڑھتی ہے۔ گو معاملات اور مقدمات کو تیز و چالاک آدمی بھی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ مگر مقدّمات و منصوبوں کی ترتیب اور تمام اصلاح کی تدابیر جیسی کہ چاہیئے اچھے عالم و فاضل ہی کرتے ہیں۔

تم اس واسطے نہ پڑھو کہ لوگوں کے خلاف باتیں کہیں گے۔ اور انکی باتوں کی تردید کرینگے یا سب باتوں کو یقین اور تسلیم کرینگے۔ یا ہم خود بہت سی باتیں بنائیں گے۔ بلکہ پڑھنے سے مقصدِ اعظم یہ ہو کہ ہم لوگوں کی باتوں کو تولیں گے۔ اور سوچیں گے۔ پھر جو عمل کرنے کے قابل ہوں گی۔ اُن پر عمل کرینگے۔ بعض کتابوں کا صرف مزہ چکھا جاتا ہے۔ یعنی اُن میں سے کچھ کچھ پڑھا جاتا ہے بعض بالکل نگلی جاتی ہیں۔ یعنی کُل پڑھی جاتی ہیں۔ مگر بے توجہی اور بے غوری سے۔ بہت تھوڑی کتابیں ہیں جو چبا چبا کے ہضم کی جاتی ہیں۔ یعنی اوّل سے آخر تک بڑی توجّہ اور غور و خوض سے پڑھی جاتی ہیں۔ کتابوں کے انتخابات سے جو کتابیں بنتی ہیں اُن کا حال آبِ مُقطّر کا سا ہے۔

آدمی پڑھنے سے کامل بنتا ہے۔ اس سے تقریر شستہ اور تحریر حیثیت دُرست ہو جاتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ آدمی کو دانشمند و تجربہ کار بنا دیتا ہے

نظم کا طبیعت میں جودت پیدا کرتا ہے۔ علومِ ریاضیہ کا طبیعت کو ذکی بناتا ہے۔ اور علومِ طبیعیہ کا ذہانت کو عمیق۔ علمِ اخلاق کا سنجیدہ متین۔ منطق و علمِ بلاغت و فصاحت کا مباحثہ و مناظرہ کی قابلیت پیدا کرتا ہے۔ غرض مطالعہ کا اثر ضرور انسان کے اوضاع و اطوار و کردار پر ہوتا ہے۔

انسان کے امراضِ جسمانی کے جیسے خاص علاج ہیں۔ ایسے ہی امراضِ ذہنی کے بھی مخصوص علاج ہیں۔ سینہ و شش کا علاج نشانہ معدے کا علاج سبج سبج قدم چلنا۔ دماغ کا علاج گھوڑے پر سوار ہونا۔ علیٰ ہذا القیاس اور علاج ہیں۔ اسی طرح اگر ذہن میں آوارگی و پریشانی ہو تو علومِ ریاضیہ کا مطالعہ اُس کا علاج ہے۔ جو اُس کے ذہن کی پریشانی کھو دیگا۔ اگر ذہن بے تمیز ہے کہ دو چیزوں میں تمیز اور فرق نہیں کر سکتا۔ تو حکمت و فلسفہ اُسکا علاج ہے۔ اگر ذہن ایسا ہے کہ وہ ایک بات کے ثبوت سے دوسری بات کی توضیح نہیں کر سکتا تو قانون دانوں کے فیصلجات کا پڑھنا اُسکی دوا ہے۔

غرض امراضِ ذہنی کے ایسے ہی علاج ہوتے ہیں۔ مطالعۂ کتب میں تو عاقلوں سے باتیں ہوتی ہیں اور کاروبارِ زندگی کے معاملات میں بیوقوفوں سے۔ جو مطالعۂ کتب ہمارے کاروبارِ زندگی میں کام نہیں آتا اُسکو بھی بیکار نہ جانو۔ کیونکہ وہ ہماری عقل و فہم کو درست کرتا ہے۔ مطالعہ ہی ایک ایسا فن ہے جو اور فنون کے استعمال کو سکھاتا ہے۔ دانشمندوں کے کلام کے مطالعے پر جو نوجوان اپنے دماغ کو متوجہ کریگا۔ تو ابتدا میں مسرت حاصل ہوگی۔ پھر دانائی کے ساتھ مواصلت کسی مطالعہ سے مسرت نہیں

ہوتی- بلکہ ہر مطالعہ کے ساتھ مسرت ہے- جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں- کہ علم کے پیچھے پڑنے سے صحت کو مضرت پہونچتی ہے- وہ بڑی غلطی کرتے ہیں- مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ کرنے والوں کی عمریں بھی ایسی ہوتی ہیں- جیسی اور پیشہ والوں کی- اس مشاہدہ کی صداقت کی شہادت تاریخ بھی دیتی ہے- طالب علموں کی باقاعدہ اور آرام کی زیست صحت و تندرستی کو زیادہ کرتی ہے- اور بہت سی تکالیف اور امراض سے بچاتی ہے مگر اس کے ساتھ یہ شرط ضرور ہے کہ وہ اپنی فضول حرارتِ جسمانی کو معتدل ورزشِ جسمانی سے کم کرتا رہے اور جسم کو کاہلی کا عادی نہ بنائے-

آدمی اپنے وقت کاٹنے کے لئے حقہ پیتے ہیں- ہلاس سونگھتے ہیں- اور ان سے مسرور ہوتے ہیں- اب اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ جو لوگ کسی فن اور علم کا مطالعہ کرتے ہیں ان کا وقت کیسا خوشی سے کٹتا ہوگا- ابتدا میں جو اس کے اندر محنت معلوم ہوتی ہے- وہ آگے جاکر تفریح طبیعت ہو جاتی ہے-

جب آسمان پر چاند کا لمپ روشن ہو تو یہ وقت تیرے مطالعہ کے لئے اچھا ہے کہ تیری کتاب کے صفحوں پر چاندنی پڑے اور تو اس میں باریک و تاریک معانی کو دیکھے- اور چاند ستاروں کی سحر کاری کو سمجھے-

نفس کے واسطے مطالعہ ایسا ہے جیسے جسم کے واسطے ورزش و ورزشِ جسمانی سے جسمانی تنومندی اور تندرستی حاصل ہوتی ہے مطالعہ سے نیکی جو روحانی صحت ہے- ہاتھ آتی ہے- ورزش سے جو خاص جسم کی تناوری کے لئے کی جاوے کچھ تکان ہوتا ہے- اسی طرح مطالعہ سے بھی جو فقط نکوکاری کے واسطے کیا جائے کچھ تکلیف ہوتی ہے- مگر جب کہیں

پسندیدہ کام سے مسرت پیدا ہوتی ہے تو اس کی تکلیف اور تکان کی پروا نہیں ہوتی۔ شکار کھیلنے سے مسرت و بہجت ویسی حاصل ہوتی ہے۔ کہ اسکی محنت راحت معلوم ہوا کرتی ہے۔ ایسی ہی تمثیلات اور نقل و حکایات کی نصائح کے مطالعہ سے انبساط و بہجت روحانی حاصل ہوتی ہے اور اسکی محنت کچھ نہیں معلوم ہوتی۔

بعض مطالعہ کرنے والے ایسے نادان ہوتے ہیں۔ کہ متقدمین کی وہ کتابیں مطالعہ میں رکھتے ہیں۔ جنکا بہت سا حصہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا لیکن جہاں کہیں کوئی مضمون اُن کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ تو خوشی کے مارے اُچھل پڑتے ہیں۔ اور کپڑوں میں پھولے نہیں سماتے۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے۔ کہ دس باتوں میں سے ایک سمجھ میں آئی تو کیا آئی۔

(ذکاء اللہ)

سوالات

۱۔ مطالعہ کے فوائد تحریر کرو۔؟
۲۔ چالاک آدمی اور عالم میں کیا فرق ہے۔؟
۳۔ پڑھنے کا کیا مقصد ہونا چاہئے۔؟
۴۔ کن کن علوم کے مطالعہ سے کیا کیا فوائد ہوتے ہیں۔؟
۵۔ امراضِ ذہنی کا علاج مطالعہ سے کیونکر ہو سکتا ہے۔؟
۶۔ دانشمندوں کا کلام مطالعہ کرنے سے نوجوانوں کو کیا کیا فائدے ہوتے ہیں۔؟
۷۔ ثابت کرو کہ مطالعۂ کتب سے صحت کو نقصان پہونچنے کا خیال غلط ہے۔؟
۸۔ ثابت کرو کہ مطالعہ ایک اچھا شغل ہے۔؟
۹۔ کیا ثبوت ہے کہ نفس کو مطالعہ نافع ہے جیسی بدن کے لئے ورزش۔؟
۱۰۔ کیسی کتابوں کا مطالعہ بہتر ہے۔؟

سفر

تحصیلِ علم کے دو طریقے ہیں۔ ایک اصولی۔ دوسرا عملی۔ جو علم کتب

سے حاصل ہوتا ہے اُسکو اصولی اور جو سفر کے ذریعہ سیکھا جاتا ہے اُسکو عملی کہتے ہیں۔ اصولی قاعدہ عموماً دوسرے شخصوں کے خیالات یا اُنکے مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتا ہے۔ برعکس اسکے ذاتی مشاہدے اور شخصی تجربے کا نام عملی طریقہ ہے۔ صورتِ اوّل میں ہم دوسروں کی مدد کے محتاج اور دست نگر ہیں۔ اور شکلِ دوم میں ہم مختار اور آزاد ہیں۔ یا یوں کہئے کہ ایک حالت میں ہماری رفتار کا انحصار بیرونی حرکت پر ہے اور دوسری صورت۔ ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم۔ پر کاربند ہونا پڑتا ہے۔ پس ظاہری عملی طریقہ کالنقش فی الحجر کا حکم رکھتا ہے اور صحیح نتائج کے پیدا کرنے میں بہت معاون ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انسانی زندگی دقتوں کی گتھی اور پیچیدگیوں کا مجموعہ ہے۔ کبھی انسان کو مصیبت و تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی رنج و غم کا۔ اور کبھی غربت و نکبت کا۔ اور چونکہ مجموعی شکل میں یہ رکاوٹیں ہیں جو انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ عملی طریقے کو خیرباد کہے۔ اور اصولی قاعدے سے اپنے علم کی پیاس کو فرو کرے اور صرف کتب ہی پر قناعت کرے۔ لیکن وہ مبارک شخص جو ان بلاؤں سے بری ہے یا پہلو میں ایک جوشیلا اور پُر اُمنگ دل رکھتا ہے۔ کسی طرح محض مطالعۂ کتب سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اُس کا جدّت پسند دماغ اور اُسکا محقق دل کبھی اجازت نہ دیں گے کہ مدرسے کے گوشے یا کتب خانے کی چار دیواری میں محدود رہے۔ شیخ سعدی۔ ابن بطوطہ۔ سر سیّد کی سوانح عمریاں ہمارے اس دعوے کی مدلّل ثبوت ہیں۔

طریقۂ عملی کی اس قدر وضاحت اور تعریف سے میرا یہ منشاء نہیں ہے۔

کہ صرف سفر ہی تحصیل علم کا معقول ذریعہ ہے بلکہ مطالعۂ کتب و اخبار بینی وغیرہ بھی اکتساب علم کے خاص ذرائع ہیں۔ اور اس کے حاصل کرنے میں ایک معتدبہ مدد دیتے ہیں۔

سفر لغوی معنی کی رو سے صرف شہر سے باہر جانے پر دلالت کرتا ہے لیکن اصطلاحی معنی کے لحاظ سے بہت وسیع لفظ ہے۔ ہر ایک عجیب غریب شئے کو بہ نظرِ تحقیق مشاہدہ کرنے کے علاوہ غیر ممالک کو دریافت کرنا نئی نئی تجارت سے مستفید ہونا۔ دنیا کے نشیب و فراز سے واقفیت پیدا کرنا سفر کے معنی آخری میں داخل ہیں۔ وہ قومیں جنھوں نے سفر کے مفہوم کو بخوبی سمجھ لیا ہے اور اپنی زندگی کے مدعا میں دنیا کا سفر کرنا بھی داخل کر لیا ہے آج ترقی کے فلک الافلاک پر صدر نشیں نظر آتی ہیں۔ لیکن افسوس ہم ہندستانیوں میں جہاں بدقسمتی سے اور بھی کئی عیوب موجود ہیں وہاں یہ عیب بھی عموماً پایا جاتا ہے کہ ہمکو سفر کرنا نہیں آتا۔ حالتِ سفر میں باوجود دونوں آنکھیں رکھنے کے اندھے اور باوجود صحیح دماغ کے بیچے بن جاتے ہیں۔ بجائے اسکے کہ سفر ہماری معلومات میں اضافہ کرے اور اس طرح ہماری روح کو فرحت بخشے ہمارے لئے دوزخ کا ایک نمونہ بن جاتا ہے اور ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح جلد ممکن ہو مکان میں حفاظت کے ساتھ بند ہو جائیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان کی یہ پرانی مثل کہ "گھر کی آدھی باہر کی پوری سے اچھی ہے،، ہندوستانیوں کی رائے کا اظہار جو وہ سفر کی نسبت رکھتے ہیں۔ صاف الفاظ میں کر رہی ہے۔ کہ سفر اور سقر میں بہت کم فرق جانتے تھے۔ برخلاف اسکے اہلِ فرنگستان و اہلِ امریکا کو ملاحظہ فرمائیے۔ اور انکے خیالات کو پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سفر ان کی زندگی کا جزو اعظم ہے۔

وہ سفر میں حیات انسانی کی جھلک دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج یورپ اور امریکہ کے ممالک تہذیب کے میدان اور اخلاق کے مسکن بنے ہوئے ہیں۔ ہماری کوئی بات خواہ استدلال ہی پر کیوں نہ مبنی ہو، اس وقت تک ثبوت نہیں حاصل کر سکتی جب تک یہ دیکھ لیں اپنی سیاحت میں وزن کر کے اس کو پرکھ نہ لیں۔ ہم میں جو گھر میں رہ گئے سست ہو گئے۔

نیز خدا کرے کہ بعض چند سالوں میں سفر کا شوق پیدا ہوا ہے تو وہ یورپ اور امریکہ جا کر یہ دیکھیں کہ ان کے اخلاق و عادات ان کی تہذیب اور معاشرت کیسے کمال تک پہنچے ہیں اور سوچ سمجھ کے فائدے اٹھائیں۔ ہم زمین و آسمان کے قلابے ملایا کرتے ہیں اور مطلب کی بات ندارد۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اصول سفر آپ کے گوش گزار کئے جائیں۔ ان اصولوں کے بیان کرنے سے پیشتر یہ گزارش ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل امور کا اپنے کو پابند بناؤ۔

۱۔ جس مقام کی سیر کرنا منظور ہے اس کے مجمل حالات سے اگر ممکن ہو پہلے ہی آگاہی حاصل کر لو۔

۲۔ ایک روزنامچہ اپنے ساتھ رکھو جس میں ہر ایک قابل ذکر چیز کا حال درج کرو۔

۳۔ نہایت ضروری ہے کہ اخلاق پسندیدہ اور عادات حمیدہ سے اپنے کو آراستہ کرو کہ جس جگہ جاؤ ہر شخص عزت سے پیش آئے اور خود داری کو ہمیشہ ملحوظ رکھو تاکہ تمہاری عزت اپنے ملک کی نیک نامی کا باعث ہو اور اس کا دل تمہاری طرف مائل ہو۔

اپنا جادو نہ چلا سکیں - ورنہ گمان غالب ہے کہ پردیس بجائے رحمت الٰہی کے قہرِ ذوالجلال بن جائے -

اِس قدر پابندی کے بعد سفر یقینی نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگا بشرطیکہ مندرجۂ ذیل اصول نظر انداز نہ کئے جائیں -

۱- قوتِ فیصلہ کو صحیح قاعدے پر پیدا کرکے کام میں لاؤ - ورنہ بہت ممکن ہے کہ تم سفر کے اصلی مطلب کو فوت کر دو - اور غیر ضروری چیزوں کو بافوقیت سمجھو - میں اس موقع پر قابلِ مشاہدہ چیزوں کی ایک فہرست پیش کرتا ہوں جو کم و بیش ہر مقام پر پائی جاتی ہیں - بادشاہوں کا دربار خصوصاً اُس موقع پر جب کہ سفیروں کو باریابی کا موقع حاصل ہو -

عدالتیں جب کہ اُن میں مقدمات پیش ہوں - عبادتگاہیں - خانقاہیں منہدم یادگاریں - بندرگاہیں - برباد شدہ کھنڈرات - کتب خانے - مکاتب - مختلف کارخانجات - محلات - باغات - توشہ و سلاح خانہ جات - لین دین کے بازار - شہسواری کے کرتب - اور دوسری کسرتیں - فوج کی قواعد - اور دیگر چیزیں جو اُس شہر کی خصوصیات سے ہوں -

۲- اُس مقام کی جہاں کا قصد ہے زبان سے کم و بیش واقفیت پیدا کرو تاکہ اُس مقام کو اُسکی اصلی شکل میں دیکھ سکو - اور وہاں کے تمدنی، معاشرتی اخلاقی اور مذہبی پہلوؤں پر روشنی ڈال سکو - اور اپنے علم میں اضافہ کر سکو - چونکہ ہر ملک کی زبان سیکھنا تقریباً ناممکن ہے اس لئے انگریزی زبان کے سیکھنے پر اکتفا کرو - کیونکہ رُوئے زمین کے کُل خزائن اُسی میں محفوظ ہیں - اور کرۂ ارض کی دوسری زبان ہونے کا اُسکو شرف حاصل ہے -

۳- قابلِ مشاہدہ چیزوں کے انتخاب میں اور اُن کو استقلال سے معائنہ کرنے میں ہوشیاری سے کام لو۔ اور صرف اپنے ہی مذاق کے مطیع نہ بن جاؤ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک حجام سے جس نے اِس سے پیشتر دربارِ شاہی میں دخل نہیں پایا تھا۔ دریافت کیا گیا کہ اُسنے وہاں کیا دیکھا۔ جواب دیا۔ کہ بادشاہ کے بال عمدہ طریقے سے تراشے ہوئے تھے۔ بیچارے حجام ہی پر کیا منحصر ہے۔ سوداگر بندرگاہوں اور لین دین کے بازاروں کو خاص طور سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ سپاہی قلعوں سلاح خانوں اور میگزینوں کو طلبہ کتب خانوں اور مباحثوں کو۔ مُدبّر عدالتوں کو۔ غرضکہ ہر ایک شخص اپنے پیشہ اور مذاق کا گرویدہ ہے۔ اور دوسری نادر چیزوں سے ناآشنا نظر آتا ہے اِسی طرح اس میں ایک خاص کمی باقی رہ جاتی ہے جسکا دُور کرنا رفتہ رفتہ اُسکی قدرت سے باہر ہو جاتا ہے۔

۴- غیر ممالک میں سفیروں اور سکتروں سے ملاقات کرو۔ تاکہ تم کو اُن ممالک کے حالات بھی معلوم ہو جائیں۔ اُن بزرگوں کی زیارت بھی ضرور کرو۔ جو لازوال شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ تاکہ تم کو معلوم ہو جائے کہ زندگی اور شہرت میں کس طرح کا رابطہ پیدا ہوتا ہے۔ اور جب تم سفر سے واپس آؤ تو اُس مُلک سے بالکل تعلق قطع نہ کرلو۔ بلکہ وہاں کے واقفکاروں سے خط وکتابت کو جاری رکھو۔ تاکہ وہاں کی تبدیلیاں اور حالات تمکو معلوم ہوتے رہیں۔

۵- بہ موقع دو کہ دوسرے شخص تم سے سفر کے متعلق سوالات کریں تم اپنے مشاہدے کو خود بخود بیان نہ کرو۔ اپنے خیالات۔ جذبات اور مشاہدات پر پورا قبضہ رکھو۔ اور موقع اور محل پر اُن کا اظہار اپنے دوستوں

کی موجودگی میں کرو۔ قرینِ قیاس واقعات کے بیان کرنے میں اختصار سے کام لو اور خاص کر عوام کے سمجھانے میں۔ ورنہ وہ بجائے عمدہ رائے قائم کرنے کے تمھارے تجربات کو قصّہ و کہانی سے تعبیر کرینگے فارسی کی ضرب المثل کو "جہاندیدہ بسیار گوید دروغ" ایسے ہی سیّاحوں کی لفاظی اور فضول گوئی کا نتیجہ ہے جو اصولِ مذکورہ پر عامل نہیں ہیں۔

اور نئے ممالک میں جاکر اپنے طریقِ معاشرت اور طرزِ تمدن و آداب کو بالکل فراموش نہ کرو۔ اور وہاں کی ہر ایک شے کے عاشق نہ بن جاؤ۔ بلکہ خذ ما صفا و دع ما کدر پر کاربند ہو۔ اور بعض عمدہ باتوں کو چن کر اپنے ملک میں رواج دینے کی کوشش کرو۔

یہ ہیں وہ اصول جنکی پابندی نے یوروپ کو یوروپ اور امریکہ کو امریکہ بنا دیا۔ اور اُن کی خلاف ورزی نے ہندوستان کو اُبھرنا تو کیا اصلی حالت پر قائم نہیں رکھا۔ اس فرق کو دیکھیے اور عبرت حاصل کیجئے۔ ع بر رسولاں بلاغ باشد و بس۔

(حامد حسین رضوی)

سوالات

۱۔ تحصیلِ علم کے کتنے طریقے ہیں ہر ایک کا مفصل حال بیان کرو۔
۲۔ شیخ سعدی۔ ابن بطوطہ۔ اور سرسید کی سوانح عمریاں کس دعوے کی مدلل ثبوت ہیں۔؟
۳۔ سفر کے لغوی اور اصطلاحی معانی بیان کرو۔!
۴۔ ہندوستانی سفر کو بُرا کیوں کہتے تھے ؟
۵۔ ہندوستانی یوروپ اور امریکہ کے سفر سے کما حقّہ فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے۔؟
۶۔ سفر میں کن اُمور کا لحاظ ضروری ہے اور کیوں۔؟
۷۔ سفر کے وہ اصول بیان کرو جن سے وہ یقینی نعمتِ غیر مترقبہ ہو سکے۔؟
۸۔ کن اصول کی پابندی سے یوروپ یوروپ اور امریکہ امریکہ بن گیا ہے۔؟

لنڈن

لنڈن ایک بہت وسیع اور عظیم الشان شہر ہے۔ اسکی اصلی وسعت کا اندازہ ہندوستان کے کسی شہر سے نہیں کیا جا سکتا۔ دلی اور علی گڑھ لنڈن کے چند گلی کوچے ہیں۔

شہر مختلف اضلاع میں منقسم ہے اور ہر ضلع گویا ایک علیحدہ شہر ہے۔ پس لنڈن کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک پہونچنے کے لئے وہی وسائل درکار ہیں جو ہندوستان میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں جانے کے لئے۔

تمام لنڈن کی سرزمین کے نیچے زمین دوز راستے ہیں۔ جن پر ہر دو دو میل کے فاصلے سے ایک اسٹیشن بنا ہے۔ ان زیر زمین اسٹیشنوں میں مسافر لفٹ کے ذریعہ سے نیچے آتے ہیں۔ اور ریل پر سوار ہوکر جہاں ضرورت ہو جا سکتے ہیں۔

سطح زمین پر ٹرام برقی ایک مقام سے دوسرے مقام کو جاتی ہے۔ اسکی وضع بالکل بمبئی کی ٹرام سے مشابہ ہے۔ لاتعداد ہر وقت ایک مقام سے دوسرے مقام کو جاتی رہتی ہیں۔ ایک قسم کی موٹر گاڑیاں بھی ہیں یہ بھاپ سے چلتی ہیں۔ ان کی تعداد بھی کثیر ہے۔

علاوہ بریں ٹیکسی موٹر گاڑیاں ہیں۔ جہاں دیکھیے قطاروں کی قطاریں سڑک کے وسط میں ایستادہ ہیں۔ ان میں یہ انتظام ہے کہ میٹر کے ذریعہ سے کرایہ خود بخود تحریر ہوتا رہتا ہے اور اسی حساب سے دینا پڑتا ہے۔ گھوڑا گاڑیاں یہاں کم ہیں مگر پھر بھی بکثرت ہیں۔ باوجود اسکے یہ ذرائع ضروریات کے لحاظ سے محض ناکافی ہیں۔

آب و ہوا میں یہ شہر کوئٹہ سے مشابہ ہے برف باری کے زمانے میں

اگرچہ سردی زیادہ ہوتی ہے بالعموم ترشح ہونے کے باعث ہمیشہ ابر
سے چھپا آسمان رہتا ہے - اور آفتاب کی صورت ہفتوں نظر نہیں آتی -
بارہ بجے سے شام تک چراغ اور فانوس روشن رہتے ہیں - یہاں کا
کہرا ایک بلائے عظیم ہے جس کا اندازہ مشکل ہے جب کہرا چھا جاتا ہے
تو پھر ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا - شعلہ پردۂ فانوس سے باہر نہیں آ سکتا
تمام آمد و رفت بند ہو جاتی ہے - اور لوگ قریب قریب دامن میں پناہ
لیتے ہیں - مگر اب کہرا ایک شاذ چیز ہے - اور صرف ایک بار میرے
تجربہ میں آیا -

عظمت برطانیہ حقیقت میں یہاں آ کر معلوم ہوتی ہے زمانے کی
ترقی کے ساتھ نظم حکومت کے قواعد تبدیل ہو گئے ہیں کہ ہندوستان
یا ایشیا کے رہنے والوں کو اس کا ذہن نشین کرنا نہایت مشکل ہے - اگر
کوئی یہ دریافت کرے کہ اس تہذیب و تمدن کا سب سے بہتر ثمر کیا
ہے تو میں یہ کہوں گا - آزادی - اور اگر مجھ سے یہ دریافت کیا جائے کہ
آزاد ملک کی کیا تعریف ہے تو میں یہ جواب دوں گا - سه

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را با کسے کارے نباشد

ارسطو کا قول ہے کہ عدم مساوات سے زیادہ کوئی شے قوموں کو ذلیل
اور مغلوب نہیں کرتی اور چونکہ ایشیا صدیوں تک مطلق العنان
حکومتوں کی خلافت گاہ رہی ہے اہل ایشیا لفظ آزادی کا مفہوم
سمجھنے سے قاصر ہیں -

یہاں امیر اور فقیر مفلس اور تونگر شہری ہونے کی حیثیت سے
ہم پلہ ہیں - ہر شخص اپنا فرض ادا کرنے اور منصب بجا لانے تک

پابند ہے - اس سے زیادہ اُسپر کوئی قید نہیں ملازم کو آقا سے خائف ہونے کی اور ماتحت کو افسر کی سفارش کی کوئی حاجت نہیں - کوئی حاکم بالا دست اپنے محکوم سے بیجا باز پرس نہیں کرسکتا - اور کوئی آقا ملازم پر دست تعدی دراز نہیں کرسکتا - قانون نے میزان عدل میں تول کر جو حقوق تفویض کردیے ہیں - اُنکی خلاف ورزی کی حالت میں عدالت چارہ دہ ہے اور کسی کو ایسی جسارت نہیں ہوتی کہ انصاف کو اپنے ہاتھ میں لے لے -

جب سر راہ پولیس کا سپاہی اپنی ایک اُنگلی سے منع کردیتا ہے تو عوام کیا خواص خواہ سر پر قیامت ہی کیوں نہ آئے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کرسکتے - اور وہ ادنےٰ ملازم حکومت خود اس قدر پابند ہے کہ ضعیف عورتوں - اپاہج اور معذور لڑکوں اور معصوم بچوں کو خود ایک جانب سے سڑک کے دوسری جانب تک بہ حفاظت پہونچا دیتا ہے - اور راستہ بھولے ہوئے کو خضر راہ بن کر منزل کا پتہ اور نشان دیتا ہے - ہر وقت ہر حالت میں مدد کو تیار رہے - ہر شخص کی حکومت اُسکے وطن تک محدود ہے اُس کے بعد کوئی کسی کا حاکم نہیں -

جہاں یہ لوگ قانوناً اس قدر آزاد ہیں وہیں تمدن کی زنجیروں سے اس قدر بستہ ہیں کہ تعجب معلوم ہوتا ہے - بار حکومت جہاں اس قدر کم ہے - وہیں بار علائق اس قدر زیادہ ہے کہ شاید اس سے زیادہ سرگرداں قوم اور نہو -

اخلاق میں یہ لوگ نمونہ ہیں - ملازموں کی مستعدی اور فرمانبرداری بیان سے باہر ہے - اپنا فرض منصبی بجالانے میں کبھی دریغ نہیں کرتے - دوکانوں اور قہوہ خانوں کے ملازمین مرد اور عورتیں اِسقدر خوبی اور

خوش کلامی سے اپنا کام کرتے ہیں کہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی سلیقہ شعاری اور مستعدی کو تجارت کے فروغ میں بڑا دخل ہے۔ جس شخص سے راستہ دریافت کیجیے بجئے اور بڑا اپنا کام حرج کرنے اور ہمراہ جانے کے لئے تیار ہے۔ اگر کوئی شے گر جائے تو ہر شخص کوشش سے تلاش کے بعد آپ کو پہونچا دے گا۔

قومی اعتبار اس درجہ ہے کہ بہت سی چیزوں میں نہ رقعہ ہے نہ رسید مگر کسی قسم کے دھوکے کا احتمال نہیں۔ تمام لندن کیا مکانات اور کیا دوکانیں ایک شیشہ خانہ ہے۔ دوکانیں تمام کھلی ہوئی ہیں۔ صرف شیشے جڑے ہیں۔ مکان سامنے سے صرف شیشے کی کھڑکیوں سے بنے ہیں جنکے سامنے کوئی لوہے کی سلاخیں یا محافظت نہیں۔ اتوار کے روز کوئی اپنے گھر سے دوکان نہیں جاتا۔ تمام کاروبار بند رہتا ہے۔ مگر کیا مجال کہ کوئی شخص جرأت کرکے ان کمزور شیشوں کے پیچھے سے ایک پائی کی چیز اُٹھالے۔ جوہری بازار میں ایک شیشے کے پیچھے بعض وقت اتنا مال ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان کی کسی ریاست کی فروخت سے روپیہ جمع کیا جائے تو اُسکا نصف نہ ہو۔

یہاں کے لوگوں میں علم اور دولت دونوں مجتمع ہیں۔ دولت یہاں بے اندازہ ہے۔ اِسکا خیال بھی ہماری حدِ امکان سے باہر ہے۔ یہاں ایک گذارہ کرنے والے آدمی کا صرف ذاتی خرچ بکفایت دس پونڈ ہے اور جس خاندان میں چار آدمی مع بچوں کے ہوں اور تین پاونڈ آمدنی ہو وہ خاندان غریب ہے۔ یہاں کے غربا ہمارے سفید پوش شرفا سے بہتر حالت میں ہیں۔ عظیم الشان عمارات کی چوٹیاں آسمان سے باتیں

کرتی ہیں۔ اور ایک ہوٹل کی عمارت کی قیمت ہماری ایک بستی سے زائد ہے۔ ہر قہوہ خانہ ایک بہارستان ہے۔ سڑکیں از حد وسیع اور کشادہ ہیں اور دونوں جانب پیادہ چلنے کے راستے ہیں۔

اس لاتعداد دولت کے اجتماع کا باعث تجارت ہے۔ یہاں تاجر سے بڑھکر کوئی شخص صاحب جاہ نہیں۔ ہر سال تاجروں میں سے ایک شخص شہر لندن کا افسر اعلیٰ مقرر کیا جاتا ہے۔ دوکانوں کا طول عرض بیان سے باہر ہے۔ بڑی دوکان کی محض سیر کرنے کے لئے ایک ہفتہ درکار ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو یہاں مہیا نہ ہو جائے تاجر جب حاضر لئے ہوئے۔

غرض لندن ایک عجیب و غریب مقام ہے جہاں بے انتہا دولت جمع ہے جو جملہ فنون کا مخزن ہے جو سب سے بڑی سلطنت کا پایۂ تخت ہے۔ جہاں ان عجائبات دنیا کا دیکھنا تعجب اور رشک کا باعث ہے وہیں انسان سوسائٹی کی اندرونی حالت کو دیکھ کر تاسف کرتا ہے۔

اس ترقی سے اگر اپنے تنزل کا مقابلہ کیا جائے تو مولانا حالی کا قول یاد آتا ہے جہاں ایک پیر دانا کے یہ کہنے پر کہ جس قوم میں عقل۔ علم۔ دولت میں سے کوئی شئے نہو اُسے ترقی کا کرنا بہتر ہے۔ آپ نے فرمایا ہے۔ —

مجھے ڈر ہے اے میرے ہمقوم یارو　　مبادا کہ وہ ننگ عالم تمہیں ہو

(ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری)

سوالات

۱- لندن کیسا شہر ہے اسکی وسعت اور اسکے حصص میں آمد و رفت کے وسائل بتاؤ؟

۲- لندن کی آب و ہوا کی نسبت کیا جانتے ہو؟

۳- لندن میں کہرے کی کیا کیفیت ہوا کرتی ہے؟

۴- لندن میں لوگوں کی آزادی کے متعلق تم کو کیا معلوم ہے۔ اور ارسطو کا قول عدم مساوات کی نسبت کیا ہے؟

۵- لندن میں حاکم محکوم اور افسر ماتحت کے برتاؤ کیسے ہوتے ہیں -؟
۶- لندن میں پولیس کے سپاہی کن کن خدمات کو بجا لاتے ہیں اور وہ رعایا کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہیں ؟
۷- اہلِ لندن کے اخلاق کی نسبت تم کیا جانتے ہو -؟
۸- لندن میں قومی اعتبار کی کیا کیفیت ہے -؟
۹- اہلِ لندن کے علم و دولت کا حال بیان کرو -؟
۱۰- لندن میں دولت کی زیادتی کا کیا سبب ہے -؟
۱۱- لندن جملہ فنون کا مخزن کیوں ہے -؟
۱۲- لندن کی ترقی اور اپنے شہر کے تنزل کا مقابلہ کرو -؟

ترقی کا اعلیٰ ذریعہ تجارت ہے

سب سے زیادہ دور اندیش اور ہوشیار قوم وہ ہے جو اپنی قوت علمیہ اور کمالِ عقلیہ سے ہر چیز میں ایک قسم کی ترقی دینے کا مادہ رکھتی ہو- اور جو افعال اُس سے سرزد ہوں وہ اُس مادے کے مناسب ہوں اور اوسط درجے کی قوم وہ ہے جو خود کسی ایجاد یا ترقی کا مادہ تو نہ رکھتی ہو- مگر جو سامان اُسکو پہلے لوگوں کی عقل کی بدولت مہیا ملا ہے یا جو قدرتی طور پر اُسکو میسّر آسکتا ہے - اُسکو اپنی حالت پر محفوظ رکھ سکے اور جو فائدے اُس سے اوروں نے حاصل کئے ہیں - وہ فائدے یہ بھی حاصل کر سکے اور جو قوم نہ کسی چیز میں ترقی دے سکے اور نہ اُسکو اپنی حالت اصلی پر محفوظ رکھ سکے - بلکہ اُسکو اور تنزل کے مرتبے پر پہونچا دے - اور اپنی سستی اور غفلت کے سبب سے اُسکی ہستی خراب کر دے - وہ سب سے گئی گذری اور ناعاقبت اندیش قوم ہے اور یقیناً وہ اس

قابل ہے کہ اپنی تمام ضروریاتِ زندگی میں اَوروں کی محتاج اور سب کی نظر میں ذلیل رہے۔

جب ہم یہ بات بیان کر چکے۔ تو اَب ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ یہ ہماری قوم جو ہندوستانی کے نام سے مشہور ہے۔ کس قسم کے لوگوں میں شمار ہونے کے قابل ہے؟ ہماری رائے میں وہ سب سے اخیر قسم کے لوگوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ جس نے بجائے اِسکے کہ وہ اپنی جملہ ضروریات میں ترقی کرتی ہر چیز کو بگاڑ رکھا ہے۔ اور اپنے تمام کاروبار اور جملہ اشیائے ضروریہ کی فراہمی کو اور قوموں کے حوالے کر دیا ہے۔

پس اِسکا آخری نتیجہ بجز اِسکے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ آخرکار تمام ہندوستان مفلس ہو جائیگا۔ اور تمام اسکی آمدنی کے سرچشمے غیر قوموں کے ہاتھ آجائیں گے۔

دیکھو! معاملات تعلیم و تربیت میں جو اصل الاصول ترقی ہیں ہندوستانیوں نے بالکل اپنے حکامِ وقت پر بھروسا کر لیا ہے اور اِس بھروسے کو یہاں تک ترقی دی ہے۔ کہ اگر آج حکامِ وقت اپنے سررشتۂ تعلیم کو توڑ دیں یا اُس سے توجہ اُٹھا لیں۔ تو ہمکو امید نہیں کہ ہندوستان کا ایک ضلع بھی وہاں کے باشندوں کی تعلیم کا کچھ فکر کر سکے۔ بابِ تجارت میں ہندوستانیوں کو اِس سے زیادہ کچھ نہیں آتا۔ کہ وہ اپنے ملک کی پیداوار کو بھی اَوروں کے ہاتھ نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کرتے رہتے ہیں اور آخرکار اُس پیداوار کے نتیجے کو جو اور قومیں اپنی صنّاعی سے پیدا کرتی ہیں نہایت گراں قیمت پر فروخت کرتی رہتی ہیں۔ عام ملکی ضروریات میں ہندوستان کی یہ حالت ہے کہ اگر وہ انگلستان سے

ماتحت نہ ہوتا اور انگلستان سا ترقی یافتہ مُلک اُسپر حکمراں نہ ہوتا تو شاید وہ ایسی صدہا چیزوں سے محروم رہتا جو اس وقت اُسکو حاصل ہیں۔ اور جنکے سبب سے اُس میں تھوڑی شایستگی معلوم ہوتی ہے۔

پس جب اُس مُلک کے باشندوں کی یہ حالت ہو۔ تو کیونکر اُسکو اپنی ضروریات میں کامل خیال کرسکتے ہیں اور کب اِس بات کا یقین ہو سکتا ہے کہ جس مُلک کی دولت اور مُلک کو چلی جاتی ہے وہ ہمیشہ مالدار رہے گا۔

آمدنی کے ذریعوں میں ظاہرا دو ذریعے ایسے معلوم ہوتے ہیں جو تمام ذرائع کو حاوی ہیں۔ ایک زراعت اور دوسرا تجارت۔ مگر ان دونوں ذریعوں میں زراعت تو ایک ایسی چیز ہے کہ اُس میں انسان ایک خاص قسم کی ترقی کرسکتا ہے۔ اور وہ بھی ایک حدِ معینہ تک۔ مگر تجارت ایک ایسا تمام اور قابلِ ترقی ذریعہ ہے کہ اس کے سبب سے انسان کو اصناف انواع کی ترقی حاصل کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ اور اس کے واسطے کوئی ایسی حد نہیں نکلتی جسکے آگے ترقی ناممکن ہو بلکہ جہاں تک انسان کی عقل کو رسائی ممکن ہے وہاں تک اُسکی بھی ترقی ممکن ہے۔ اور وہی ایک ایسی چیز ہے۔ جس میں انسان اپنے ہر طرح کے کمالات اور خوبیاں ظاہر کرسکتا ہے۔ اور وہی تمام صناعیوں دستکاریوں اور ہنرمندیوں کی جڑ ہے۔ مگر نہایت افسوس ہے۔ کہ ہنوز ہمارے مُلک میں لوگوں کی طبیعتیں اِس طرف راغب نہیں ہوئیں۔ بلکہ اُنھوں نے اپنے حاکم قوم یورپین کی لیاقت پہ اس قدر اعتماد کر رکھا ہے۔ کہ سب کام اپنی بہتری کے اُسکے قبضے میں دے رکھے ہیں۔ حالانکہ ہمارے بھائی ہندوستانیوں کا ایک

ایسا خیال غلط ہے - جو یقیناً ملکی ترقی اور قومی اعزاز کو خراب کرنے والا ہے - فرض کرو - کہ یہی تاجر قوم ہمارے ملک کے ساتھ ایک تاجرانہ تعلق رکھتی ہوتی اور جو تعلق اسکو ہمارے ساتھ ملاکرتا ہے - وہ نہ ہوتا اور دلی خیرخواہی اسکے دل میں صرف اس وجہ سے ہے کہ ہندوستان انکا ملک ہے اور ہندوستان کے باشندے انکی رعایا ہیں - وہ نہ ہوتی تو ہندوستانیوں کی یہ حالت ہندوستان کو کیسی مضرت پہونچاتی - اور جو رونق کہ ہندوستان میں اس وقت سرکار گورنمنٹ کی توجہ کی بدولت ہے وہ بالکل نیست و نابود ہوتی -

ہر ملک کو ایک بوستان پر بہار کے مانند فرض کیجیے - اور اسکے باشندوں کو خوشنما پودوں کے مثال تصور کیجیے - پس اگر کسی باغ میں خوشنما پودوں کی جگہ سوکھے درخت ہوں یا اگر ہرے ہوں تو ان میں کسی قسم کا پھل یا پھول نہ ہو - تو کیا ایسا باغ کچھ مفید ہوگا ؟ یا اسکی کچھ قدر و منزلت ہوگی ؟ اسی طرح اگر کسی ملک کے باشندے علم و ہنر یا صناعی اور دستکاری سے آراستہ نہ ہوں - بلکہ درخت بے ثمر کے مثل ایسے کمالات سے عاری ہوں - تو کیا اس ملک کی کچھ قدر و منزلت ہوگی یا اس سے کسی قسم کے نفع کی امید ہوسکے گی - ہرگز نہ ہوسکے گی -

پس ہمارے ہموطنوں کو چاہیے - کہ وہ اپنے آپ کو ہر طرح سے آراستہ کریں اور دنیوی کمالات سے محروم نہ رکھیں - جنکی مثال ایک بے ثمر درخت کے ساتھ دیکھائے - اور کمالات دنیوی کے واسطے یقیناً سب سے بڑا ذریعہ تجارت ہے - جو انسان کے دل کو ہر قسم کے کسب کمال کی جانب راغب اور ملکی رونق کو دوچند کردیتا ہے - سیر و سیاحت کی عادت

اور آباد ملکوں کی سیر اور عجائبات روزگار کے دیکھنے کی نوبت بلاشبہ انسان کو تجارت ہی کی بدولت پہونچی ہے۔ اور انسان کے دل میں عالی حوصلگی کا جوش جس پر تمام ترقیوں کا مدار ہے۔ بلاشبہ اسی تجارت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور سب سے آخری فائدہ جو اس بے نظیر پیشے کی بدولت انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ تجربہ کاری ہے جسکے بغیر انسان اپنے کسی کام کو استحکام اور مضبوطی کے ساتھ نہیں کرسکتا۔

لیکن ہم یقین کرتے ہیں۔ کہ جب ہندوستان کے باشندے اس طرف توجہ نہ کریں گے۔ یہ کمالات ہمکو حاصل نہیں ہونگے۔

سوالات

۱- سب سے زیادہ دور اندیش- اوسط درجے کی- اور سب سے کم ترقی کی قوموں کی تعریف کرو۔؟
۲- ہندوستانیوں کا شمار کس قوم میں ہوسکتا ہے۔؟
۳- ہندوستانیوں کی موجودہ حالت دیکھکر انکے آیندہ کی نسبت کیا خیال کیا جاسکتا ہے۔؟
۴- تجارت کے خاص خاص فوائد کیا ہیں۔؟
۵- اگر ہندوستانیوں کا تعلق باہر کے ملکوں سے نہیں ہوتا تو اسکا کیا نتیجہ ہوتا۔؟
۶- جس ملک کے باشندے علم وہنر سے خالی ہیں کیا انکے واسطے صنعت سے فرصت نصیب ہونیکی امید ہے۔؟
۷- ہمارے ہموطنوں کو کیا کرنا چاہیئے۔؟

تجارت کا اثر اخلاق پر

جس طرح بڑے بڑے کامیاب تاجر نوکری کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اسکو ادنے درجے کی غلامی اور آزادی کی برباد کرنے والی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جنہوں نے علم وفضل یا مناصب وخدمات کی وجہ سے امتیاز حاصل کیا ہے بیوپار اور دوکانداری کو تو اسے ذہنی

اور عقل و اخلاق کے حق میں نہایت مضر بتاتے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ تجارت میں ہمیشہ وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں اور ہوئے ہیں جنکے اخلاق درست اور عقل سلیم ہوتی ہے۔ ایک لائق مصنف لکھتا ہے کہ "تجارت کے برابر کوئی چیز انسان کے اخلاق کی کسوٹی نہیں ہے"۔ ایک عالم جو محض کتابوں کے مطالعے اور فلسفیانہ استدلال و احتجاج میں رات دن مصروف رہتا ہے وہ خود نہیں جانتا کہ میں کیا چیز ہوں اگر وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہونا اور اپنی عقل اور اخلاق کی آزمایش کرنا چاہے۔ تو اسکو چاہیئے کہ بازار میں قدم رکھنہ کرے اس کو بہت جلد معلوم ہو جائیگا کہ وہ دانشمند اور نیک آدمی ہے یا احمق اور شریر النفس۔ اس کی کامیابی اور ناکامی خود اسکو اپنی حقیقت سے خبردار کردیگی۔ پس جو قوم تجارت سے کچھ تعلق نہیں رکھتی اسکے کسی فرد کی نسبت قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دانشمند یا نیک نہاد ہے یا احمق اور بد نہاد ہے۔

اگرچہ تاجر ہمیشہ مذہب یا کانشنس کی ہدایت سے اپنے اخلاق کی اصلاح نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی کامیابی اسمیں سمجھتا ہے کہ اسکی دیانتداری خوش معاملگی اور راستبازی پر لوگوں کو اعتماد ہو۔ لیکن جیسا کہ خصائل انسانی کا خاصہ ہے رفتہ رفتہ یہ خصلتیں جو اس نے بضرورت اختیار کی تھیں اسکی طبیعت ثانی بن جاتی ہے۔

یہ کہنا کہ تجارت قوائے عقلیہ کے حق میں مضر ہے واقعہ کے بالکل برخلاف ہے۔ جس قدر تاجر کو اپنی عقل و تدبیر سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے ایسی کسی اور پیشے والے کو نہیں ہوتی۔ نوکری پیشہ کو اپنی نوکری پر

قائم رہنے یا ترقی حاصل کرنے کے لئے صرف اپنے معمولی فرائض ادا کرنے کی ضرورت ہے اور کسان کی کامیابی فقط اُسکی محنت اور بخت و اتفاق پر موقوف ہے مگر تاجر کو باوجود اُن تمام فرائض کے جو ایک سچے تاجر کو ادا کرنے ضرور ہیں۔ ہر وقت عقل سے مشورہ لینے اور ایک شطرنج باز کی طرح نت نئی چال چلنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہر وقت زمانے کے تیور دیکھتا اور پبلک کے دل ٹٹولتا ہے اکثر اوقات اُسکو فائدۂ کثیر کے لالچ میں راستبازی کے خلاف عملدرآمد کرنے کی ترغیب ہوتی ہے مگر اُسی کے ساتھ اس بات کا خوف بھی دامنگیر ہوتا ہے کہ اگر یہ راز کھل گیا تو اعتبار نہ رہے گا۔ غرضکہ اسی قسم کی بے شمار حالتیں ہیں جن میں انسان متردد ہوتا ہے کہ کونسی جانب اختیار کی جائے۔ تاجر کو قدم قدم پر پیش آتی ہیں۔ اور اُسکو عقل و تدبیر سے کام لینے اور کامل غور کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اور اسی طرح تاجر کی عقلِ معاش روز بروز جِلا پاتی جاتی ہے۔ مگر نوکری پیشہ یا کاشتکار کو ایسے مرحلے بہت کم پیش آتے ہیں۔ وہ معمولی قواعد کے شارعِ عام پر آنکھیں بند کئے چلے جاتے ہیں۔ نوکری پیشہ اگر اپنے فرائض دیانت اور محنت کے ساتھ انجام دیتا ہے تو اُسکو اس بات کا مطلق اندیشہ نہیں کہ میری وجہ معینہ میں کچھ کمی واقع ہو جائیگی۔ کاشتکار کی کامیابی زیادہ تر آسمانی مدد پر منحصر ہے جس میں انسانی عقل و تدبیر کو کچھ دخل نہیں۔ اس لئے پہلا عدمِ ضرورت کے سبب اور دوسرا عدمِ قدرت کے سبب عقل اور تدبیر سے بہت کم کام لیتا ہے مگر تاجر خوب جانتا ہے کہ ذرا چال چوکا اور مصیبت میں گرفتار ہوا۔ اس لئے اُسکو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو قوم تجارت سے کچھ تعلق نہیں رکھتی اور نوکری کے سوا کسی اور ذریعہ سے

معاش پیدا نہیں کرتی چند نسلوں کے بعد ان میں تدبیر معاش کا مادہ باقی نہیں رہتا کیونکہ جس طرح کسی عضو کے معطل و بیکار رکھنے سے اسکی قوت زائل ہو جاتی ہے اور اس میں شکست باقی نہیں رہتی اسی طرح قوائے ذہنیہ سے جب کچھ کام لیا نہیں جاتا تو وہ بالکل انکار رفتہ ہو جاتے ہیں اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اس قوم میں مستثنے مثالیں ایسے اشخاص کی پائی جائیں جو اعلےٰ درجہ کی عقل معاش رکھتے ہوں۔ لیکن ایسے مستثنیات سے قاعدہ کلیتہ ٹوٹ نہیں سکتا۔

جس طرح تجارت سے قومی عقل معاش ترقی پاتی ہے اسی طرح عمدہ اخلاق اور عمدہ خصلتیں صرف تجارت ہی کے ذریعہ سے تمام قوم میں شایع ہوتی ہیں۔ جزرسی اور کفایت شعاری جسکے بغیر کسی خاندان بلکہ کسی قوم کا وقار دنیا میں قائم نہیں رہ سکتا صرف تجارت ہی کی بدولت تمام قوم میں سرایت کرتی ہے۔ اگرچہ ممکن ہے کہ ہر ایک قوم میں خواہ وہ قوم تجارت پیشہ ہو اور خواہ نوکری پیشہ کچھ افراد جزرسی اور کفایت شعاری کے ساتھ موصوف پائے جاتے ہوں۔ لیکن ہمارے نزدیک کوئی قوم عام طور پر جزرس اور کفایت شعار نہیں ہو سکتی جب تک کہ عام طور پر اس میں تجارت شائع نہ ہو۔

جس طرح تجارت سے جزرسی اور کفایت شعاری کی بنیاد تمام قوم میں پڑتی ہے اسی طرح تحمل۔ بردباری۔ نرمی اور موافقت بغیر تجارت کے کسی قوم کی قومی خصلت نہیں بنتی جس طرح سلطنت اور حکومت کا میلان ظلم اور تشدد اور غرور و نخوت کی جانب ہوتا ہے اسی طرح تجارت کا اقتضا یہ ہے کہ تند مزاجوں کو دھیما۔ مغروروں کو خاکسار

سخت کلاموں کو شیریں بیان اور جباروں کو منکسر المزاج بناتی ہے
جو قومیں تجارت پیشہ ہوتی ہیں ایک مدت کے بعد انکی نسلیں فطرتاً
انہی خصلتوں پر مجبول پیدا ہوتی ہیں کیونکہ اولاد کے جسمانی اور نفسانی
قوے اپنے آبا و اجداد کے جسمانی اور نفسانی قوے کے تابع ہوتے ہیں
جس طرح قوی اور تنومند ماں باپ کی اولاد تنومند ہوتی ہے
اسی طرح متحمل اور بردبار ماں باپ کی اولاد مستثنیٰ صورتوں کے سوا
ضرور ہے کہ متحمل اور بردبار ہو۔

اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیا میں ابھی تک راستباز
تاجروں کی تعداد بمقابلہ جو فروش گندم نماؤں کے بہت کم ہے۔ لیکن اس
سے تجارت کے پاک دامن پر کوئی دھبہ نہیں لگتا۔ جس طرح علم کا خاصہ
ہے۔ کہ وہ براہ راست نیکی کی راہ سمجھاتا ہے لیکن باوجود اسکے بہت سے
اہل علم اپنی بد اعمالیوں سے علم کو بدنام کرتے ہیں۔ اسی طرح تجارت
براہ راست آشتی اور راستبازی کی تعلیم دیتی ہے۔ لیکن نالائق تاجر
چند روزہ منفعت کے لئے بددیانتی اور فریب اختیار کرکے تجارت کی
پائدار برکتوں سے محروم رہتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جب تک کسی ملک کی تجارت وہاں کے تعلیم یافتہ
گروہ کے ہاتھ میں نہیں آتی بلکہ جاہلوں اور نالائقوں کے پنجہ میں پھنسی
رہتی ہے تب تک تجارت کی کامیابی کا بھید عام نظروں سے مخفی رہتا ہے اکثر
نفع یا نقصان کو امورات تقدیری میں شمار کرتے ہیں جن میں انسان کی عقل و
تدبیر کچھ کام نہیں دے سکتی حالانکہ وہ تدبیر سے ایک دم غافل نہیں رہتے۔
اصلی جرأت اور دلیری بھی جیسی تجارت کی بدولت انسان میں پیدا

ہوتی ہے ایسی کسی اور پیشے کے ذریعے سے نہیں ہوتی شاید وہ لوگ جو تجارت اور دلیری میں منافات سمجھتے ہیں اس بات کو سنکر متعجب ہوں مگر اُنکو یاد رکھنا چاہیئے کہ دلیری یا بزدلی کسی خاص فرقہ کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتی۔ ممکن ہے کہ ایک سپاہی یا سپہ سالار نہایت بزدل ہو اور ایک بیوپاری بہت بڑا بہادر ہو۔ جس طرح بہادروں کو میدان جنگ میں دلیری اور شجاعت کے کام کرنے پڑتے ہیں اسی طرح ہر شخص کو اپنی روزانہ زندگی میں اکثر موقعوں پر دلیری سے کام کرنے پڑتے ہیں۔

الغرض تجارت کی کامیابی کے لئے جسکا مدار تاجر کے مقبول و معتمد خاص و عام ہونے پر ہے۔ نہایت ضرور ہے کہ تاجر علاوہ عاقل اور مدبر ہونے کے عمدہ اخلاق اور عمدہ خصلتوں سے آراستہ ہو اور اس لئے تجارت کو انسان کا معلم اور اتالیق کہا جاوے تو کچھ بیجا نہیں۔

لڑائی جو انسان کی خونریز دشمن اور ملکوں کی غارت کرنے والی دیوی ہے اور جو اب بھی ویسی ہی مہیب اور ہولناک ہے جیسی یونان کے مشہور شاعر ہومر کے زمانے میں تھی۔ اور کبھی اُسکی تیغ خون آشام ہمیشہ کے لئے میان میں کی جائیگی تو تجارت ہی کی بدولت کی جائے گی۔ تجارت نے دنیا میں شائستگی کو پھیلایا ہے اُس نے تمام روے زمین پر انسان کی ضرورت اور آسایش کے سامان برابر تقسیم کئے ہیں۔ اُس نے علوم و فنون کی بیش قیمت اور مفید تحقیقاتوں اور ایجادوں کو رواج دیا ہے اور اُسنے موجدوں کی طبیعت میں نئی نئی ایجاد و اختراع کی تحریک پیدا کی ہے وہ علم اور دین کی اشاعت میں مدد دیتی ہے اور وہ ترقی ہمیشہ اور ہر جگہ لازم و ملزوم رہی ہیں۔

انسان کے اندرونی قوے کی ترقی - علم و فنون کی ترقی جنرل انفورمیشن کی ترقی - اخلاق کی ترقی - ضوابط و قوانین کی ترقی - آزادی کی ترقی - غرضکہ ہر طرح کی ترقی اس سے پیدا ہوئی ہے اس نے ہمیشہ جس چیز کو جس درجہ پر پایا ہے - اس سے جدا ہوتے وقت اسکو بلند تر سیڑھی پہ چھوڑا ہے وہ اوّل ایک ملک سے دوسرے ملک میں شایستگی کے لئے بطور طلایہ کے جاکر راستہ تیار کرتی ہے - اور پھر شایستگی کو اپنے ساتھ لے کر وہاں پہونچتی ہے - اس نے وحشیوں کو انسان بنایا ہے اور اسنے عوام الناس اور امرا کو بادشاہی تک پہونچایا ہے - اسی نے مُوروں کو اپنے عہد میں دنیا کا عقلمند بنایا تھا اور اسی نے انگریزوں کو اکیلا بلا شریک غیر تمام ہندوستان کا وارث ٹھہرایا -

سوالات

۱ - تاجروں اور ملازموں میں ایک دوسرے کے کام پر اعتراض کرنے کے کیا اسباب ہیں - ؟

۲ - اخلاق کی کسوٹی سے کیا مراد ہے - ؟

۳ - جو قوم تجارت نہیں کرتی ہے اسکے کسی فرد کی نسبت قطعی رائے قائم کرنا کیوں دشوار ہے - ؟

۴ - تاجر کا اخلاق کیوں درست ہو جاتا ہے - ؟

۵ - ثابت کرو کہ تجارت قواے عقلیہ کے حق میں مضر نہیں ہے - ؟

۶ - نوکری پیشہ یا کاشتکار کے نزدیک تاجر کی نسبت کیوں سیدھے سادے خیال کئے جاتے ہیں - ؟

۷ - ثابت کرو کہ اگر جوا سے ویسے ہی کچھ کام نہ لیا جائے تو وہ بگاڑ اور مستقل ہو جاتے ہیں - ؟

۸ - ثابت کرو کہ نیک شعاری تجارت کرنے سے انسان کے دل میں جلد پیدا ہو سکتی ہے - ؟

۹ - اگر بعض تاجر بددیانتی کرتے ہوں تو تجارت کو برا کہنا کیوں نادرست ہے - ؟

۱۰ - اصلی جرأت اور دلیری تجارت سے کس طرح پیدا ہو سکتی ہے - ؟

۱۱ - ہومر شاعر نے اشاق کی نسبت کیا لکھا ہے - ؟

۱۲ - تجارت سے کن کن باتوں میں ترقی ہوتی ہے - ؟

آنے والی گھڑی

اے آنے والی گھڑی! ہم بیان نہیں کر سکتے کہ تجھ میں کیسی کیسی دلچسپیاں اور کیا کیا مزے ہیں تیرے دامن میں ہم اپنی ہزارہا آرزوئیں کو پالتے ہیں۔ اور اپنے لاکھوں ارمانوں کو تیری ہی آغوش میں تھپک تھپک کے سُلا دیتے ہیں۔ تو ہر بیکس و حرماں نصیب کا سہارا اور ہر شکستہ پا کے ہاتھ کا عصا ہے۔ تو ایک عجیب جادو بھری اور طلسمی دوربین ہے۔ جس میں ہر شخص اپنے مذاق اور اپنے مطلب کی خبریں دیکھ لیتا ہے۔ حرماں نصیب اپنی معشوقۂ ناز آفریں کا چہرۂ زیبا۔ لاولد اپنے ہونے والے بچے کی جیتی جاگتی صورت بیوہ مایوسی ہی کے دامن میں طرح طرح کی دلچسپیاں۔ یتیم اپنی حسرت ناک زندگی میں ہر قسم کی ترقیاں۔ خانہ نشین دنیا کے دلچسپ اور خوشنما سواد شہر۔ اور وطن آوارہ بال بچوں اور یارانِ وطن کی صورتیں۔ غرض کون ہے جسے آنے والی گھڑی میں اپنی تمنائیں اور آرزوئیں اصلی حالت میں نہیں نظر آجاتیں۔

جو گھڑی گذر گئی وہ ہاتھ سے جا چکی۔ اُسکا ذکر ہی کیا ہے۔ اور ہم سے تضییع اوقات کرنے والے ادبار نصیب اپنا عیب چھپانے بلکہ اپنے سر سے الزام کی بلا ٹالنے کے لئے یہی کہیں گے کہ افسوس دغا دے گئی۔ موجودہ گھڑی کی ہمیں قدر نہیں۔ اسکی قدر تو کچھ وہی لوگ خوب جانتے ہیں جو فی الحال ترقی کر رہے ہیں۔ جن لوگوں کا سرمایۂ ناز صرف گذشتہ نسل کی ترقیاں اور بزرگوں کے کارنامے ہوں انھیں موجودہ

گھڑی اور اس وقت سے کیا سروکار جو گذر رہا ہے۔ اور ہمیں کس موجودہ قسمت اور کس ہم صحبت دوست کی قدر ہے جو اسکی ہوگی۔ ہماری ساری امیدیں تو اسی آنے والی گھڑی کے دم سے قائم ہیں ہم اس آنے والی گھڑی میں اچھی اچھی آرزوؤں۔ طرح طرح کی تمناؤں خوشگوار لطفوں۔ اور دل خوش کن کامیابیوں کے منصوبے باندھتے ہیں جب ناکامیاں ہمارے دل کو ستاتی ہیں اور مایوسیوں کا چاروں طرف ہجوم ہوتا ہے اُسوقت یہ آنے والی گھڑی دور ہی سے ہمیں ایسی ایسی ترقیوں اور کامیابیوں کی دلفریب صورتیں دکھاتی ہیں کہ ہم محو حیرت ہو جاتے ہیں۔ اور جب ہمارے گوش دل میں اس کی یہ الہام کی ایسی اطمینان بخش صدا آتی ہے کہ سب تیرے لئے ہیں تو پھر ہمیں نہ کوئی صدمہ یاد رہتا ہے اور نہ کوئی رنج و الم۔ ہماری اس پُر مصیبت زندگی کو صرف یہی چیز گوارا بلکہ خوشگوار بنائے ہوئے ہے کہ زندگی کے آنیوالے میدان ہیں اور اُسکے اُن مرغزاروں میں جن میں ابھی ہمارا گذر نہیں ہوا ہے۔ ہم عجیب جوش و مسرت سے اُن خوشیوں اور دلچسپیوں کو دیکھا کرتے ہیں۔ جن تک اُمید دور سے دکھا دکھا کے ہماری دلفریبی و دلداری کیا کرتی ہے۔ اور اسی کی برکت ہے کہ سامنے کا ہر منظر جو دھندلکے دامن کے اندر سے ہلکا ہلکا نظر آتا ہے ہمیں اُن عام مناظر سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتا ہے جنھیں ہم طے کر چکے ہیں۔ اور اسی شان سے ہر وہ خیالی تصویر بھی زیادہ دلربا اور نظر فریب دکھائی دیتی ہے جسے واہمہ ہم سے دور ہٹا کے بُعدِ مسافت کی تیرگی کے دامن پر بنا دیتا ہے۔

واقعی وہ عجیب فرشتۂ رحمت ہے جو ہماری محو حیرت آنکھوں کو اس

سامنے کی آنے والی فضا میں لیجاتا اور اُن میں یہ قوّت پیدا کر دیتا ہے
کہ استقبال کے تیرہ گوں دامن کو چاک کر دیتا ہے تاکہ اُن دلربا صورتوں
کو دیکھ لیں جو اور کسی جگہ نہیں نظر آسکتیں مگر اس سے بڑھ کے
عجیب وہ فرشتۂ غضب ہے جو موجودہ گھڑی پر مُتصرّف ہے۔ حقیقت
میں یہ کتنے بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہی آنے والی گھڑی جب
پاس آپہونچتی ہے اور موجودہ گھڑی بن جاتی ہے تو نہ کہیں وہ دلچسپیاں
ہوتی ہیں نہ وہ دلفریبیاں۔ نہ اُن آرزوؤں کا پتہ لگتا ہے جنھیں ہم
نے اُس آنے والی گھڑی کی گود میں تھپک تھپک کے سُلایا تھا
اور نہ اُن ارمانوں کا جو اُسکے دامن میں پل رہی تھیں۔

آہ کیا قیامت ہے کہ ہم دل میں جو جو منصوبے باندھتے ہیں اور
اُن جن ہوسوں کو تیرے دامن سے وابستہ سمجھتے ہیں جب تو ہمارے
پاس آپہونچتی ہے تو وہ سب ایک خواب و خیال کی طرح ہو جاتے
ہیں ہم اپنے دل سے عہد و پیماں کرتے ہیں کہ آنے والی گھڑی میں
یہ کریں گے اور وہ کریں گے۔ اس اس طرح پسینہ بہا کے کوشش
کریں گے۔ اور یوں جان توڑ توڑ کے محنت و مشقت کریں گے مگر ادھر تو
آگئی اور ہم اُس سارے عہد و پیمان کو بھول گئے۔ اور جس طرح تمام
موجودہ گھڑیوں کو پڑے ہی پڑے کاہلی و غفلت سے کھو دیا کرتے ہیں
تجھے بھی کھو دیا۔ سچ بتا۔ تو وہ دلدار ناز آفریں تو نہیں جسکا وصل
نصیب ہوتے ہی ہم اپنی ساری تمنائیں اور دل کے تمام منصوبے
بھول جایا کرتے ہیں۔ تو وہ پری وش تو نہیں جسکا ایک جلوہ ہوش ربا
ساری آرزوؤں اور ارمانوں کو بھلا دیا کرتا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے

وصال یار میں تو مسرت و کامیابی کی محویت پرانی آرزوؤں کو بھلاتی ہے۔ اور جب تو پاس آکے پہونچتی ہے تو بجائے خوشیوں اور مسرتوں کے ہر طرح کی مصیبتوں اور ہر قسم کی فکروں کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔

افسوس۔ آنے والی گھڑی میں واقعی اور حقیقی کامیابیوں کا جلوہ دیکھنے کے علاوہ ہم نے کیسے کیسے خیالی کرشمے دیکھ پائے تھے اس آیندہ کی زمین پر ہمنے اپنے خیال کی طبع آزمائی سے کیسی کیسی عالی شان عمارتیں قائم کی تھیں۔ کیسے کیسے دلچسپ اور روح افزا باغ لگائے تھے۔ جن میں تیرے دامن تک اپنا ہاتھ پہونچنے کے بعد دیکھا تو وہ تمام عمارتیں منہدم تھیں اور وہ چمن شداد کی جنت کی طرح نظر سے غائب تھے۔ آہ کیا کسی اور کو بھی یا ہمیں کسی اور حالت میں اتنا بڑا نقصان برداشت کرنا پڑا تھا۔ مگر نہیں اے آنے والی گھڑی! جتنی تو اپنی آیندگی کی حالت میں مہربان و شفیق تھی اتنی ہی موجودگی کی حالت میں تو ظالم و نا خدا ترس ہے۔

ہم زمانے کی تیز رو گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ جو بڑی تیزی کے ساتھ دنیا کی بہار دکھاتی ہوئی ہمیں عرصۂ ہستی سے نکال لیجاتی ہے۔ آنے والی چیزوں کے دیکھنے کا شوق اتنا بڑھا ہوا ہے کہ پیچھے پھر کے دیکھتے نہیں موجودہ گھڑی پر تیز روی کے سبب سے نظر نہیں جمتی۔ آنے والی فضا میں طرح طرح کے زندگی بخش سبزہ زار اور عجیب قسم کے لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں۔ امیدیں یقین دلا رہی ہیں کہ اُن مرغزاروں میں پہونچ کے ہم اپنی روح تر و تازہ کرلیں گے اور اُن کھیتوں سے اپنے حوصلے کے کھلیان اور اپنی ہوس کے کھتے بھرلیں گے مگر قریب آتے ہی وہ مرغزار اور کھیت کچھ ایسا ہتھ دسپہ بدل کے اپنی دلفریب صورت اس قدر بگاڑ

اپنی صورتوں پر کچھ ایسا بے مزہ پردہ ڈال کے اور اس عجلت و تیزی سے نکل جاتے ہیں کہ ہم دیکھتے رہ جاتے ہیں پاس سے گزرتے ہیں اور ہمیں خبر نہیں ہوتی - بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ ہماری بدقسمتی سے یہ گھڑی ہی ہماری تمام آئندہ خوشیوں اور مسرتوں کو کچلتی اور پیستی ہوئی نکل جاتی ہے -

کیا اچھا ہوتا اگر اے آنے والی گھڑی تو ہمیشہ آنے والی ہی رہتی کبھی نہ آتی تو عمر رواں کی گاڑی کسی ایک ہی جگہ پر کھڑی رہ جاتی اور ہم موجودہ حالت سے قطع نظر کرکے جن میں تکلیفوں اور مصیبتوں کے سوا کچھ نہیں - آنے والی آرزوؤں اور امیدوں کا خواب ہی دیکھا کرتے -

(شرر لکھنوی)

سوالات

۱- مصنف نے آنے والی گھڑی کو کن کن ناموں سے یاد کیا ہے -؟
۲- وقت کی قدر کون لوگ کرتے ہیں؟ اور ہم لوگ ان سے علیحدہ کیوں خیال کئے جاتے ہیں؟
۳- مایوسی کے عالم میں ہمکو کیا چیز خوش رکھتی ہے -؟
۴- ہمکو کس طرح سے کن باتوں کی کیا کیا امیدیں ہوتی ہیں اور ان کا انجام کیا ہوتا ہے -؟
۵- خوشیوں اور مسرتوں کے بجائے مصیبتوں اور فکروں کو کون لاتا ہے -؟
۶- مصنف نے خیالی اپچ اور عادتوں سے کیا مراد لی ہے -؟
۷- ہم آئندہ کی نسبت کیا خیال کرتے ہیں اور اسکی اصلیت کیا ہوا کرتی ہے -؟
۸- اگر آئندہ کا وقت کبھی نہ آتا تو کیا نتیجہ ہوتا -؟

صبح

یہ دلفریب گھڑی علی الدوام پسند کی جاتی ہے - اور واقعی عجیب سماں وقت ہوتا ہے جب کہ ہر ایک کی طبیعت میں ایک جوش پیدا ہو جاتا ہے

ہر کوشش میں ایک تازگی ہوتی ہے - جذبات دل پر انگیختہ ہو جاتے ہیں -
اور ہر شخص سچے دل سے اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے - اُس وقت
شیخ و برہمن دونوں کی عبادت میں خلوص اور اثر پیدا ہوتا ہے - کھیت
جوتنے والا ہر وا اہا جتنا کام اس وقت کی دو گھڑیوں میں کرلیتا ہے - دن بھر
میں نہیں کرسکتا - شاعر جیسی خیال آفرینی اس وقت کر سکتا ہے اور کسی
وقت ممکن نہیں - مسافر سے جیسی سریع السیری اس نور کی گھڑی
میں ظاہر ہوتی ہے اور وقت دشوار ہے -

اس وقت کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے - تو عجیب عجیب
متضاد کیفیتیں نظر آتی ہیں - یوں تو زاہد کی نماز - برہمنوں کی پوجا -
مسافروں کے راہ طلب میں قدم رکھنے - سب میں نمایاں فرق اور
ایک خاص کیفیت ہے - اور جہاں دیکھو ایک نیا سماں نظر آئیگا - مگر
اس گھڑی کی بعض حالتیں بہت ہی ممتاز اور دل پر اثر ڈالنے والی ہیں -

صبح کی اصلی حیثیتیں دو ہی ہیں - رات کا ختم ہونا - اور دن کا برآمد
ہونا - پہلی حیثیت سے پیری کسی گذشتہ کیفیت کا خاتمہ ہوتا ہے - دوسری
حیثیت سے ایک خاص زندگی کا آغاز - اور دونوں میں خوشی و غم اور
راحت و الم کے دونوں پہلو موجود ہیں - صبح و شام کی نسبت کہا جاتا ہے
کہ ان اوقات میں دو وقت ملتے ہیں - ہاں ملتے تو ضرور ہیں مگر اسکو
ملنا نہ کہنا چاہئے - کیونکہ رخصت ہونے کے لئے ملتے ہیں - ایک وقت
آتا ہے اور ایک جاتا ہے - مگر کبھی آنے والا ایسا محبوب ہوتا ہے کہ
جانے والے کی مصیبت سے نجات پانے اور آنے والے کے وصل سے
لطف اٹھانے کی خوشی ہوتی ہے - اور کبھی جانے والا ایسا عزیز ہوتا ہے کہ اُس

چھوٹنے اور فراق کی ظالم گھڑی سے سابقہ پڑنے کا غم ہوتا ہے وہ بھی صبح ہے جب کہ شبِ گذشتہ کے عیش و طرب کا خاتمہ ہوتا ہے وہ بھی صبح ہے۔ جب رات بھر کے غم و الم کی بیقراری کا خاتمہ ہوتا ہے اور آفتاب اپنی امید بھری صورت دکھا کے دل میں آرزوؤں کا چراغ روشن کرتا ہے۔ مگر ان دونوں صبحوں سے زیادہ تر متاثر شعراء ہوتے ہیں یا عشاقِ شیدا۔ لیکن کاروباری دنیا کی ایک دوسری ہی صبح ہے۔ انہیں اُن صبحوں سے کوئی سروکار نہیں۔ وہاں نہ شبِ فراق ہے نہ شبِ وصال۔ رنج و راحت دنیا میں توام ہیں۔ اور اُن کو سب ہی سے سابقہ پڑتا ہے مگر صبح نہ اُنکے رنج کو بڑھاتی ہے نہ اُنکے غم کو۔ بلکہ غور سے دیکھو تو اُن کی صبح ہمیشہ امید و آرزو کی صبح ہوتی ہے۔ ہاں اس عالم میں بھی اُنکی آنکھ کھلتے ہی رنج و الم اور درد و غم سے دوچار ہو جاتے ہوں۔ مگر اکثر بلکہ تقریباً سبھی کے لئے تازہ امیدیں لے کے آتی ہے۔ اور اُنکے امید اور آرزو سے بھرے ہوئے چہرے اس وقت چمکنے لگتے ہیں اور رات کی تیرگی دُور ہونے کے بعد کون ہے جسکے چہرے پر صبح کا آفتاب امید کا سنہرا غازہ نہ مل دیتا ہو۔

اس وقت کا آرزو بھرا سین تو ذرا دیکھو کہ کس قدر دلچسپ ہے صبح کے تارے نے جگمگا کے اپنی نیم باز مستانہ آنکھوں کے اشارے سے شیخ و برہمن دونوں کو جگا دیا ہے۔ عالم پر سے رات کا موت کا سناٹا دُور ہوا ہے۔ اور مرغِ سحر کے مؤذن نے اذان دی۔ برہمن نے صدائے ناقوس بلند کی۔ اور کلیسا والے نے گھنٹہ بجایا۔ ان سب کے ساتھ مرغانِ سحر بھی دلچسپ نغموں سے اپنی بیداری کا ثبوت دینے لگے۔

سب لوگ بستر سے خوش و خرم ہنستے کھلکھلاتے اُٹھے اور اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہونے کی تیاریاں کرنے لگے۔

سب سے پہلے کسان اپنے بیلوں کو کھول کے اور ہل کندھوں پہ رکھکے کھیتوں کی طرف چلا۔ کارخانوں میں صبح کی سیٹی بجی۔ اور مزدوروں کا غول خوش خوش بڑی بڑی فیکٹریوں کی طرف روانہ ہوئے اور ہر شخص اپنے کام سے لگا۔ گویا عالم کی مشین جو کچھ رات گئے بگڑ گئی تھی۔ اور ساری رات بند پڑی رہی تھی پھر چلنا شروع ہوئی۔ صبح کی خوشخرام نسیم لہلہاتی ہوئی کھیتوں کو لہرا رہی ہے۔ جنکا حسن اسوقت بہار پر ہے۔ اور جنگی بہار نظروں میں کھبی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ پر لطف نظارہ اُن کم سن بچوں اور نوعمر لڑکوں کا ہے جو گھروں سے نکل نکل کر کھیلتے کودتے اسکولوں کی طرف چلے ہیں۔ یہ زمین کی سب سے زیادہ قیمتی پیداوار ہیں۔ اور انھیں کی دم سے زمانے کی آیندہ امیدیں وابستہ ہیں۔ ہماری آرزوئیں ان کے تر و تازہ اور بشاش چہروں سے نمایاں ہیں۔

ان تمام چیزوں کو دیکھ کے کون ہے جسکی مردہ اُمیدیں بھی زندہ نہ ہو جاتی ہوں۔ اور جسکے دل میں ذرا بھی یاس کا خوف باقی رہتا ہو۔ اسی سے ثبوت ملتا ہے کہ دنیا فی نفسہ خوشیوں اور امیدوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور ہر چیز ہم سے کامیابی اور مقصد وری کا وعدہ کرتی ہے۔ ان باتوں کو کارکنان قدرت ہر صبح کو نہایت وضاحت سے آشکار کر دیا کرتے ہیں۔ لہذا صبح کامیابی و مقصد وری ہی سے بھری ہوئی ہے۔ رہے جو بعض لوگ شاکی نظر آتے ہیں وہ انکا ذاتی نقص ہے۔ صبح وہ بری نہیں ہے لیکن ہاں انسان کو اختیار ہے کہ اپنی صبح بری بنالے یا بھلی۔

(شرر لکھنوی)

سوالات

۱- صبح کے وقت کون کون لوگ کیا کیا کام کرسکتے ہیں-؟
۲- صبح کی اصلی حیثیتیں کیا ہیں اور اُن کے آثار کیا کیا ہیں-؟
۳- صبح کے آٹھ دو پہرے سین کی حالت بیان کرو-؟
۴- عالم کی مشین جو رات کو بند پڑی رہتی ہے صبح کو وہ کس طرح کھلتی ہے-؟
۵- ثابت کرو کہ دنیا خوشیوں اور امیدوں سے بھری پڑی ہے-؟

تدبیر اور امید

یہ عام اور غیر متبدّل قاعدہ قدرت کے قانون کا ہر ایک چیز کے ہونے کے لئے اُس سے پہلے اُن چیزوں کا ہونا ضرور ہے جو اُس کے ہونے کے لئے ایک ضروری سبب ہیں ایسا ہے کہ کوئی چیز مادّی ہو یا غیر مادّی- ہماری عمدہ یا ذہنی آس سے متعلق نہیں جتنی چیزیں ہماری آنکھ کے سامنے آتی ہیں یا آتی ہیں اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو اُن چیزوں کے بغیر ہو گئی ہو جو اُس کے ہونے کے لئے قدرتاً مقدم ہیں- جتنے خیالات ہمارے ذہن میں گذرتے ہیں- اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کے پہلے وہ باتیں ہمارے ذہن میں نہ آچکی ہوں جو اُس خیال کے پیدا ہونے سے پہلے عادتاً ضروری ہیں- جتنی چیزیں ہیں اُن میں قدرت نے باہم ایسا تسلسل اور ارتباط رکھا ہے کہ ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری پیدا ہوتی ہے- پس ہر چیز کے حاصل کرنے کے لئے اُن چیزوں کا پہلے مہیا کرنا جو اُس کے لئے بطور آلات اور معدات اور مقدمات کے ہیں- تدبیر ہے اور اُن کے مہیا کرنے پر اُس چیز کے حاصل ہونے

کی توقع کرنا بیہودہ ہے۔ اور بغیر اسباب کے کسی چیز کے پیدا ہونے کا خیال کرنا جنون و ناوانی ہے۔ اور بلا مہیا کرنے ان اسباب کے اس شے کے حاصل ہونے کی توقع کرنا حماقت ہے۔ اور جو چیزیں کسی چیز کے ہونے کی اصلی سبب نہوں ان سے اس شے کے ہونے کی توقع کرنا تدبیر کی غلطی ہے۔

یہ بات جو ہمنے بیان کی ایسے نادان سے لے کر کامل حکیم تک۔ اور جاہل سے لے کر عارف باللہ تک۔ اور ملحد سے لیکر شارع تک سب نے تسلیم کیا ہے اور سب مانتے چلے آئے ہیں اور ہم سب ہر وقت اور ہر لحظہ ہر چیز میں اس قاعدے کا برتاؤ دیکھتے رہتے ہیں چنانچہ ہم اسے ایک صاف اور روشن مثال میں سمجھاتے ہیں۔ دیکھو ایک دہقان غلہ پیدا کرنے کے لئے کیا کرتا ہے۔ اور اسے غلہ حاصل کرنے سے پہلے کس کس چیز کا مہیا کرنا ضرور ہوتا ہے۔ پہلے وہ اچھی زمین تلاش کرتا ہے جس میں زراعت کی قابلیت ہو۔ پھر وہ ان آلات کو جمع کرتا ہے جنکی زمین بنانے کے لئے ضرورت ہے۔ پھر وہ ان آلات کو کام میں لاتا ہے اور جو خود رو گھاس یا پرانی کھیتی کی بیخیں اور نکمی چیزیں اس میں پڑی رہ جاتی ہیں ان کو صاف کرکے زمین کو اصلی ہیئت پر لاکر اسے بناتا ہے۔ پھر وہ سوچتا ہے کہ کس جنس کی اس وقت ضرورت ہے تاکہ لوگوں کی حاجت رفع ہو اور اچھی قیمت ملے۔ آخر وہ مختلف جنسوں میں سے ایک یا چند چیزوں کو اختیار کرکے اسکا عمدہ بیج ڈھونڈھتا ہے۔ اور مختلف دکانوں۔ مختلف بازاروں میں خود پھر پھر کر اسے تلاش کرتا ہے اور اپنے نزدیک وہ ایسا بیج جو نہ سڑا ہو نہ گلا ہو نہ بوسیدہ ہو نہ ناقص سوائی قیمت دیکر لیتا ہے۔ پھر اسے ایک اندازہ معین سے زمین میں ڈالتا

ہے۔ پھر اُسے مٹی میں ملا کر چھپا دیتا ہے۔ پھر اُگنے کے بعد وقتاً فوقتاً پانی دیتا ہے اور جو خود رو گھاس پیدا ہو جاتی ہے اُسے دُور کرتا رہتا ہے۔ پھر سب سے زیادہ اُسے اُس وقت حفاظت کرنی پڑتی ہے جب کہ دانہ پڑتا ہے اور جسکے کھانے کے لئے چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ آتے ہیں۔ پھر جب اِن تدبیروں کے کرنے کے بعد اُس کی کھیتی ارضی و سماوی آفات سے محفوظ رہی۔ اور اُن باتوں سے جو اُس کے اختیار سے خارج ہیں خدا نے اُسکی زراعت کو بچایا تب وہ ایک دانے کے سَو سَو اور ہزار ہزار حاصل کرتا ہے اور اپنی محنت اور تدبیر کا مزہ پاتا ہے۔

پس اِن سب چیزوں کا مہیّا کرنا اور اِس تسلسل اور ارتباط اور ترتیب کا لحاظ رکھنا تدبیر ہے اور یہ اِسکے پھل پانے کی توقع کرنا سچّی امید ہے۔ اور اِن میں سے کسی چیز کو چھوڑ دینا یا کسی ترتیب اور ارتباط میں چوک جانا یا کسی امر کی تقدیم و تاخیر کا لحاظ نہ کرنا یا وقت پر کسی چیز کو استعمال میں نہ لانا تدبیر کی غلطی ہے اور کسی چیز کا باوجود سعی کے نہ ملنا یا کسی اتفاقی امر کا پیش آجانا یا کسی ارضی و سماوی آفت سے اُس زراعت کا خراب ہو جانا تقدیر کی مخالفت ہے۔

(نواب محسن الملک سید مہدی علی خان بہادر)

سوالات

۱۔ قدرت کے قانون کا غیر متبدّل قاعدہ کیا ہے۔؟
۲۔ دہقان کو غلّہ پیدا کرنے کے لئے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔؟
۳۔ دنیا میں سچّی امید کیا ہے۔؟

گلشنِ امید کی بہار

انسان کی طبیعت کو خدا نے انواع و اقسام کی کیفیتیں عطا کی ہیں

مگر یہ زمین جس قدر تخمِ امید کو پرورش کرتی ہے۔ اُس کثرت سے کسی کیفیت کو سرسبز نہیں کرتی۔ اور اور کیفیتیں خاص خاص وقت پر اپنا اثر کر اُٹھتی ہیں۔ یا بمقتضائے سن خاص خاص عمروں میں اُنکے اثر ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر اُمید کا یہ حال ہے کہ جس وقت سے اِس بات کی تمیز ہونے لگی کہ حالتِ موجودہ ہماری کچھ خوش حال یا بدحال بھی ہوسکتی ہے۔ اُسی وقت سے اُسکی تاثیر شروع ہو جاتی ہے۔ اُمید ایک رفیقِ ہمدم ہے۔ کہ ہر حال اور ہر زمانے میں ہمارے دم کے ساتھ رہتا ہے۔ دمبدم دلوں کو بڑھاتا ہے۔ اور سینے کو پھیلاتا ہے خیالات کو وسعت دیتا ہے۔ اور نئی نئی کامیابیوں کی ترغیبیں دیتا ہے۔ غرض ہمیشہ کسی نہ کسی خوشحالی کا باغ پیشِ نظر رہتا ہے کہ یا اس سے کوئی کلفت رفع ہو۔ یا کچھ فرحت زیادہ ہو۔ خدا کی نعمتیں اور ساری خوش نصیبی کی دولتیں حاصل ہو جائیں پھر بھی یہ جادو نگار مصوّر ایک نہ ایک ایسی تصویر سامنے کھینچ دیتا ہے۔ جسے دیکھکر یہی خیال آتا ہے کہ بس یہ بات ہو جائیگی تو ساری ہوسیں پوری ہو جائینگی۔ اور پھر سب آرزوؤں سے جی سیر ہو جائیگا۔

اسمیں بھی شک نہیں کہ امید کا ہونا ہر حال میں ضرور ہے۔ مفلسی۔ بیماری۔ قید۔ مسافرت۔ بہت سے دنیا کے دُکھ۔ درد ہیں۔ کہ امید نہو۔ تو ہرگز نہ جھیلے جائیں۔ آسا جیے۔ نراسا مرے۔ یہ نعمت جو بظاہر کس و ناکس میں عام ہو رہی ہے۔ وہ ضروری شے ہے۔ کہ دنیا کی بہتر سے بہتر حالت بھی ہم کو اِس ضرورت سے بے نیاز نہیں کرسکتی۔ کیونکہ حقیقت میں یہ مشغلے زندگی کے بہلاوے ہیں۔ اور انکا سہارا ہمارا دل نہ بڑھاتا رہے۔ تو ایک دم گذرنا مشکل ہو جائے اور زندگی وبال ہونے لگے۔ بیت

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار   پر امید وصل میں برسوں گوارا ہوگیا

اس میں شک نہیں - کہ امید دھوکے بہت دیتی ہے - اور اُن باتوں کی توقع پیدا کرتی ہے - جو انسان کو حاصل نہیں ہو سکتیں - مگر وہ دھوکے اصلی نعمتوں سے سوا مزا دیتے ہیں - اور نرے موہوم وعدے قسمت کی لکھی ہوئی دولتوں سے گراں بہا اور خوشنما معلوم ہوتے ہیں - اگر کسی معاملے میں ناکام بھی کرتی ہے - تو اُسے ناکامی نہیں کہتے بلکہ قسمت کی وجہ کہکر ایک اس سے بھی اعلیٰ یقین سامنے حاضر کر دیتی ہے -

میں ایک رات ان ہی خیالات میں حیران تھا - اور سوچ رہا تھا کہ انسان کے دل میں شوق کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے - جس سے اپنے تئیں آپ دھوکے دیتا ہے - اور بے مانند آیندہ پر رنگ آمیزیاں چڑھا کر خود اپنے لئے امید و بیم اور نفع و نقصان کے سامان تیار کر لیتا ہے - یکایک آنکھ لگ گئی دیکھتا ہوں کہ میں ایک باغ نوبہار میں ہوں - جس کی وسعت کی انتہا نہیں - امید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے - آس پاس سے لیکر جہاں تک نظر کام کرتی ہے تمام عالم رنگین و شاداب ہے - ہر چمن رنگ روپ کی دھوپ سے چمکتا - خوشبو سے مہکتا - ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے - زمین فصل بہار کی طرح گلہاے گوناگوں سے بوقلموں ہو رہی ہے - اور رنگارنگ کے جانور درختوں پر چہچہے بھر رہے ہیں - یہ سماں بہار کا دیکھکر دل پر ایک عالم طاری ہوا - کہ سرتاپا محو ہوگیا - جب ذرا ہوش آیا - تو ان چمنستانوں کو نظر غور سے دیکھنے لگا - اور ایسا معلوم ہوا - کہ اگر آگے چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لطف زیادہ ہو -

پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دور آگے رنگیلے چمکیلے پھول کھلے ہیں - اب

زلال کے چشمے دھوپ کی چمک سے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں اُونچے درخت جھنڈ کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں۔ جو جانور دھیمی دھیمی آواز سے بولتے سُنائی دیتے تھے۔ یہاں خوب زور وشور سے چہکار رہے ہیں۔ چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہاتے ہیں۔ اور پھول اپنی خوشبو سے مہک پھیلاتے ہیں۔ مگر پھر یہاں سے جو نظر اُٹھائی۔ تو اور ہی طلسمات نظر آیا۔ یعنی دیکھا کہ سامنے جو درخت جھوم رہے ہیں آنکھ تیار میوے زمین کو چوم رہے ہیں۔ اُس لطف نے اور آگے بڑھنے کو للچایا۔ چنانچہ قدم اُٹھایا۔ مگر جُوں جُوں آگے بڑھتا گیا۔ زیادہ حیران ہوتا گیا۔ کیونکہ جو ہریاول سامنے سے لہلہاتی دکھائی دیتی تھی۔ پاس پہنچ کر اسکی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ اور میوے تو گرہی چکے تھے۔ بلبلیں جو چہچہے بھر رہی تھیں۔ وہ آگے آگے اُڑتی چلی جاتی تھیں۔ اگرچہ میں بہت پھرتی سے پہونچا تھا۔ اور جو بہاریں تھیں وہ بھی ہر قدم پر سامنے ہی تھیں۔ مگر تو بھی ہاتھ نہ آسکیں۔ گویا میرے شوق کو دہکاتی تھیں۔ کہ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا۔ وہ اور بھی آگے بڑھتی جاتی تھیں۔

اگرچہ بار بار خوش اور دمبدم غمگیں ہوتے ہوتے دق ہوگیا تھا۔ مگر دل کے کان میں کوئی یہی کہے جاتا تھا۔ کہ چلے چلو۔ جو نعمتیں دہکا رہی ہیں کبھی نہ کبھی ہاتھ بھی آئیں گی۔ آخر چلتے چلتے ایک جمگھٹا نظر آیا۔ کہ جس میں زن و مرد خرد و کلاں بہت سے آدمی اُچھلتے کودتے چلے جاتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ سب کسی مجلس یا میلے میں جاتے ہیں۔ یا کسی نشاطِ عام کے جشن میں شامل ہوتے ہیں کیونکہ ہر ایک کے منہ پر یقین

کا رنگ چمک رہا تھا۔ اور ایک ایک آنکھ سرمۂ شوق سے روشن نظر آتی تھی ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہر ایک کی خوشی کچھ خاص قسم کی ہے۔ کہ وہ اُنہی کے دل میں ہے۔ سب ملے جُلے ساتھ ہی چلے جاتے تھے۔ مگر نہ کوئی اپنا ارادہ دوسرے کو بتانا چاہتا تھا۔ نہ اپنے فکر کا راز دوسرے کو جتانا گوارا کرتا تھا۔ بہت لوگوں کی گرمیِ رفتار سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اگر کوئی شوق کی پیاس سے تڑپتا ہو۔ تو اُنہیں اُسکے بجھانے کی فرصت نہیں۔ اس واسطے اُن کے روکنے کو جی نہ چاہا۔ اور تھوڑی دیر تک غور سے دیکھا کیا۔ ایک بڈھا نظر آیا۔ کہ باوجود بڑھاپے کے اِن ہی میں شامل تھا۔ ہاتھ پاؤں بہت مارتا تھا۔ مگر کچھ ہو نہ سکتا تھا۔ مَیں نے خیال کیا۔ کہ بڈھے کو اب کیا ہوس ہوگی۔ اِسے تو شاید کچھ جواب دینے کی فرصت ہو۔ چنانچہ آسے سلام کیا۔ بڈھے نے تیوری بدل کر منھ پھیر لیا۔ اور کہا صاحب دِق نہ کیجیے آپ جانتے بھی ہیں؟ جس وقت کی کہ ہم عمروں سے آرزو کر رہے تھے وہ وقت آن پہونچا ہے۔ اَب ایک عہد آتا ہے کہ تمام عالم فارغ البالی سے مالا مال ہو جائیگا۔ افلاس زدہ اور طالبِ روزگار بیچارے ٹیکس اور محصولوں کے مارے آئے دن کی جاں کنی سے خلاص ہو جائیں گے۔ بلکہ فلک کے سیمرغ جو اہل عالم کے کاروبار میں رات دن سرگرداں ہیں۔ وہ بھی بال ڈال کر آرام سے بیٹھ جائیں گے۔

مَیں نے بڈھے کو اُسکی خشکیِ دماغ کے حوالے کیا۔ اور وہیں ٹھہر گیا اِتنے میں ایک شخص سامنے آیا۔ جس کی ملائمتِ شکل اور آہستگیِ رفتار سے معلوم ہوا کہ شاید کچھ اخلاق سے پیش آئے۔ مگر جب میں اُسکی

طرف بڑھا تو اُسنے جھک کر ایک سلام کیا۔ اور کہا اگر آپ کی خدمت کی فرصت ہوتی تو مَیں بہت خوش ہوتا۔ مگر اَب تو اُس خوشی کا ہوش نہیں۔ کیونکہ بیس برس سے مَیں ایک عہدے کی امیدواری کر رہا تھا۔ اَب وہ خالی ہوا چاہتا ہے۔ مَیں نے اُسے کبھی چھوڑا۔ اور ایک اور کو جا لیا۔ وہ گھبرایا ہوا جاتا تھا کہ چچا کی میراث پر قبضہ کرے۔ کیونکہ اُسکی بیماری کی خبر سننے میں آئی تھی۔ اسکے پیچھے ایک اور شخص دیکھا۔ کہ بے تحاشا بھاگا چلا جاتا تھا۔ اُسنے ایک غوطہ خوری کی کل ایجاد کی تھی۔ اُسکے دریائے منافع میں غوطہ مارا چاہتا تھا۔ یعنی اگر کچھ اور نہ ہو۔ تو ایجاد کا انعام ہی ہاتھ آجائے۔ ایک شخص کو دیکھا کہ تھوڑی دُور چلتا ہے۔ اور ٹھہر جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ طولِ بلد اور عرضِ بلد کے خیالات پھیلا رہا ہے اور سرکارِ علم سے انعام کا امیدوار ہے۔

جب جا بجا سے ٹکریں کھائیں۔ تو سوچا کہ اوروں سے دریافت کرنا بے حاصل ہے۔ اَب جو اپنی آنکھ کہے وہ ٹھیک ہے۔ آگے بڑھو۔ اور آپ دیکھو۔ کہ اتنے میں ایک نوجوان شوقین بے پروا سا نظر آیا۔ وہ آزادی کے عالم میں مسکراتا چلا جاتا ہے اُسے دیکھکر دل میں کہا کہ بھلا ایک دفعہ تو اُسے بھی ٹٹولنا چاہئے۔ چنانچہ معمولی سوال کا سبق اُسے بھی سنایا۔ وہ ہنسا اور کہا۔ صاحب! جہاں آپ کھڑے ہیں۔ یہ ملکۂ اُمید کا باغ ہے۔ وہ ملکۂ آرزو کی بیٹی ہے۔ ذرا سامنے دیکھو بہت سی پریاں خوشنما اور نفیس نفیس چیزیں لئے کھڑی ہیں۔ جن لوگوں کو تم نے زور شور مچاتے دیکھا۔ یہ اُن ہی کے اشارے پر للچائے ہوئے دوڑے جاتے ہیں۔

آنکھ اٹھا کے دیکھوں - تو فی الحقیقت سامنے ایک ایوانِ عالی لیشان
ہے - اور اُسکے صدر میں ایک پری جس کا گلزارِ جوانی عینِ بہار پر ہے
سرِ تخت جلوہ گر ہے - مسکراہٹ اُسکے زیرِ لب - پارے کی طرح لوٹتی ہے
لعل و جواہر - تاج - طرہ - شمع - موتیوں کے ہار - خلعت زرنگار کشتیوں
میں چنے ہوئے آگے دھرے ہیں - قسمت و نصیب جہان کی نعمتیں
سجائے اُسکے دائیں بائیں دست بستہ حاضر ہیں اور بہارِ زندگی کے
پھولوں کا فرش سامنے بچھا ہے عیشِ مدام اور فرحتِ دوام
سے چہرہ روشن ہے اُسکے لبوں کی مسکراہٹ اور آنکھ کی لگاوٹ عام
سے خاص تک برابر سب کی حق شناسی کر رہی ہے - اُس سے
ہر شخص یہی سمجھ رہا ہے - کہ ملکہ میری ہی طرف متوجہ ہے - اور اسی
بھروسے پر ہر ایک فخر و ناز کے مارے پھولا نہیں سماتا -

یہ دیکھکر میں ایک ٹیلے پر چڑھ گیا کہ وہاں سے ہر جگہ نظر پہونچ سکتی
تھی اور اس جمگھٹ کے بھی ایک ایک آدمی کا حال خوب خیال
میں آتا تھا - وہاں سے معلوم ہوا کہ باغِ اُمید کے اندر جانے کے
دو دروازے ہیں - ایک داروغۂ دانش کے اختیار میں ہے -
دوسرا داروغۂ خیال کے تحت میں ہے - داروغۂ دانش ایک
تند مزاج اور سوداسی شخص ہے - کہ جب تک بہت سے سوال اُلٹے
سیدھے حجتیں نہیں کر لیتا - تب تک قفل کی کنجی کو جنبش نہیں دیتا مگر
داروغۂ خیال لئیق اور ملنسار شخص ہے - یہ اپنا دروازہ کھلا ہی رکھتا
ہے بلکہ جو اُسکی حد میں جائے اُس سے بڑی عزت و توقیر کے ساتھ
پیش آتا ہے چنانچہ جو لوگ داروغۂ دانش کی حجتوں سے گھبرائے

تھے۔ یا انہیں اُسنے جانے نہیں دیا تھا۔ اُن لوگوں کی بھیڑ اُسکے دروازے پر لگ رہی تھی۔ داروغۂ دانش کے دروازے سے ملک کے تختگاہ خاص کو رستہ جاتا تھا۔ مگر اِس راہ کی تنگ تنگ پھسلنی سڑک پیچ تلی رستے ایسے اونچے نیچے تھے کہ کٹھن گھاٹی اسی کو کہتے ہیں۔ جب کسی قسمت والے کو وہاں سے اجازت مل جاتی تھی تو اِس کٹھن گھاٹی میں دکھ بھرنے پڑتے تھے۔ اگرچہ چڑھنے والے پہلے سے بھی رستے کے اونچ نیچ اچھی طرح جانچ لیتے تھے۔ اور جو جو بچاؤ کے مقام تھے۔ اُن میں قدم قدم پر نشان کرتے تھے۔ مگر کبھی پھر بھی ایسی مشکلیں پیش آتی تھیں۔ جنکا نشان و گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ جہاں صاف سیدھا رستہ سمجھے ہوئے تھے۔ وہاں کچھ ایسا خطرہ پیش آتا تھا۔ کہ یکایک تھم جانا پڑتا تھا۔ ہزاروں الجھاووں میں اُلجھے تھے۔ صدہا رپٹوں میں رپٹے تھے۔ بہتیرے ٹھوکریں کھا کھا کر گرتے تھے۔ اکثر خس پوش گڑھوں میں جا پڑتے تھے۔ غرض ایسی ایسی خطرناک وارداتیں اور ناکامی کے صدمے تھے۔ کہ بہت آدمی تو پہلے ہی دھاوے میں اُلٹے پھر آتے تھے۔ بہتیرے رستے میں غش کھا کر رہ جاتے تھے۔ بعض بعض ایسے بھی تھے کہ اُن کی استقلال سے راہ تھی۔ وہ اُسکی دستگیری سے ملک کے ایوان تک جا پہنچتے تھے۔ اِن میں اکثر ایسے ہوتے تھے۔ جو ٹیلے کو دیکھ کر پچھتاتے تھے۔ کہ ہائے ہماری محنت تو اس سے زیادہ تھی۔ یہ تو کامیابی نہیں ہوئی حق تلفی ہوگئی ہے۔ باقی جو لوگ آخیر انعام لے کر پھرتے تھے۔ اُن کا انجام یہ ہوتا تھا۔ کہ دانائی داروغۂ دانش کی بی بی ملکہ کی مصاحب تھی۔ وہ اُنکا ہاتھ پکڑتی تھی۔ اُسکی رہنمائی سے وہ لوگ گوشۂ قناعت میں جا بیٹھتے تھے۔

اے راہِ اُمید کے مسافرو! چونکہ داروغۂ دانش کی جستجو اور اُن کے رستے کی مشکلیں مجھے بہت سخت معلوم ہوئیں- اِس لئے مَیں نے داروغۂ خیال کی طرف رُخ کیا- یہاں بارگاہ کی طرف جانے کو کوئی معمولی سڑک نظر نہ آئی- مگر ملکہ صاف سامنے کھڑی تھی- وہ یہاں سے سراپا ساری نظر نہ آتی تھی اور اپنی عجائب و غرائب نایاب اور بیش قیمت چیزوں پر سب کو پیار حسنِ طلب کے انداز دکھاتی تھی پھر بھی لطف یہ تھا- کہ ایک ایک دل کو اپنی ہوا میں جدا جدا انداز سے اُڑا رہی تھی جس سے ہر شخص جانتا تھا کہ جو نگاہ مجھ پر ہے- وہ کسی پر نہیں- اور مجھ سے زیادہ کسی کو کامیابی کی امید نہیں- اسی واسطے بجائے خود کسی کا دماغ پایا نہ جاتا تھا- پہاڑ اِس خیالی رستے کی طرف سے ایسا ڈھلواں تھا- کہ قدم نہ ٹھہر سکتا تھا- کیونکہ وہی باتوں میں پائداری کہاں تا باوجود اِسکے آمد و رفت کے نشان بہت کثرت سے تھے- کیونکہ اِس رستے میں چلنے والے بہت ہیں- اِسکی سڑک سایہ دار درختوں سے ایسی چھائی ہوئی تھی کہ کسی کو جانا مشکل نہ معلوم ہوتا تھا- ساتھ ہی اِس کے ہر شخص یہ جانتا تھا- کہ جو رستہ مَیں نے پایا ہے وہ کسی کو ہاتھ نہیں آیا-

یہ بدنصیب لوگ بہتیرے جتن کر رہے تھے- بعضے تو ایسے کلدار پر گانے کی فکر میں تھے- جنکی حرکت کبھی تھمے ہی نہیں- بعضے کہتے تھے کہ جو ہو سو ہو- اِن ہی قدموں چلے جاؤ- بلا سے مرجاؤ- یہ سب ہمتیں کرتے تھے- اِسپر بھی زمین سے اُٹھ نہیں سکتے تھے- اور اُٹھے تو وہیں گر پڑے- مگر میاں پڑے تھے- تاک ادھر ہی لگی تھی- اور اِس حال تباہ پر

خود پسندی کا یہ عالم تھا - کہ جو لوگ سامنے عقل کی کٹھن منزل میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے - اُن پر پڑے پڑے ہنستے تھے -

اکثر خیال کے پیارے اور وہم کے بندے - ایسے بھولے بھالے تھے جنھوں نے اِس باغ میں آکر اور دل کی طرح چڑھنے کا ارادہ بھی نہ کیا تھا - یونہی ایک جگہ پڑے رہے تھے - یہ مقام کاہل گھاٹی کہلاتا تھا - اور ایک سنسان اور بے آزار موقع پر تھا - مگر بلکہ یہاں سے بھی سامنے تھی یہ اسی یقین میں خوش پڑے تھے کہ کوئی دم میں وہ خود یہاں آیا چاہتی ہیں - اگرچہ اور لوگ اِن وہمیوں کو احمق اور کاہل وجود سمجھتے تھے مگر انھیں کچھ پروا بھی نہ تھی - بلکہ یہ عجم غلط لوگ اسی دعوے میں خوش بیٹھے تھے کہ سب سے پہلے ہم پر نظرِ عنایت ہوگی -

اِنھی بے پرواؤں میں میں بھی پڑا پھرتا تھا - اِن میں اتنا لطف پایا - کہ اگر کوئی بات کرے - تو اُسکا جواب دیتے تھے - اور اپنی باتوں سے بھی دل خوش کرتے تھے - اسی خیال میں یکایک نظر پھیر کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ دو دیو ڈراؤنی صورت - بھیانک مورت اُس گھاٹی میں چلے آتے ہیں - کہ اُنکی کسی کو خبر نہیں - ایک تو میں جانتا تھا کہ عمر ہے - مگر دوسرا افلاس تھا اُن کے دیکھتے ہی سارے باغ اور چمن آنکھوں میں خاک سیاہ ہوگئے - اور یہ معلوم ہوا - کہ بس عیش و آرام کا خاتمہ ہوگیا - دلوں پہ خوف و ہراس چھا گیا - لوگ جو ڈر کے مارے چیخیں مار مار کر چلاتے تو گویا عالم میں ایک کہرام مچ گیا - اِسی سے میں بھی چونک پڑا - اور دیکھا - تو کچھ بھی نہ تھا -

سوالات

۱- امید بہار سے اوپر کیا کیا تاثیرات پیدا کرتی ہے؟
۲- ثابت کرو کہ ہر حال میں امید کا ہونا ضروری ہے؟
۳- امید ہم کو کیا کیا فائدے دیتی ہے؟
۴- مصنف کے خواب کا حال بیان کرو- اور اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے اسے ظاہر کرو؟
۵- گلشن امید کی بہار کا خلاصہ مطلب تحریر کرو؟
۶- مادر امید- قسمت و نصیب- نیش ایام- فرحت دوام- داروغۂ خیال- استقلال- مصلحت- داروغۂ دانش- خود پسندی- کالی گھاٹی- افلاس کی تفصیل بیان کرو؟

نا امیدی

یہ مضمون منشی لطف احمد صاحب بی۔ اے کا ہے- جو منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کے صاحبزادے ہیں- حیدرآباد میں ایک اعلیٰ عہدے پر سرفراز ہیں- نظم اور نثر دونوں اچھی لکھتے ہیں-

انسان کا دل منبع ہے جذبات اور خواہشوں کا- جذبات دل کی حد مقرر کرنا دشوار ہے- لیکن خواہشوں کی انتہا آنکھ بند ہونے تک ختم ہو جاتی ہے- مگر اسکا سلسلہ طویل ہے- ایک خواہش کے بعد دوسری خواہش اس طرح نمودار ہوتی ہے جیسے زنجیر کی ایک کڑی کے بعد دوسری کڑی- یہی جذبات اور خواہشوں کا متواتر ایک دوسرے کے بعد پیدا ہوتے رہنا- انسانی حیات میں کشمکش اور حرکت کا باعث ہوتا ہے- اگر ایک خواہش پوری ہونے کے بعد دوسری پیدا نہ ہو تو نہ صرف انسانی زندگی سست اور ساکن ہو جائے- بلکہ انسانی کوششیں بند اور انسانی ترقی رک جائے اور انسان جہاں اسکی پہلی خواہش پوری ہوئی وہیں قانع ہو کر بیٹھ رہے لیکن ایک آرزو بر آنے کے ساتھ ہی ابھی اسکا لطف اٹھانے کا اور اپنی حرکت کو روک کر ذرا دم لینے کا موقع بھی نہیں ملتا کہ فوراً ہی ایک اور

آرزو سابقہ آرزو کی جگہ لیکر دل میں گدگدی پیدا کرتی ہے اور محنت کے مارے انسان کو اس طرح بے چین کرتی ہے کہ وہ اسی طرح کمر باندھے دوسری کشمکش میں اپنے آپ کو ڈال دیتا ہے اور پھر اپنی کوششوں کو تازہ دم کرکے اس نئی خواہش کے حاصل کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہ دوڑ انسان کی زندگی بھر رہتی ہے۔ سوائے اُس آخری وقت کے جب کہ موت اور اپنے قریبی انجام کا خیال اُن خواہشوں کو اُبھرنے نہیں دیتا اور وہیں دل ہی کے اندر اُنکا دم گھونٹ دیتا ہے۔

ہر خواہش جو دل میں پیدا ہوتی ہے اُسکے دو انجام ہوتے ہیں۔ یا تو وہ خاطر خواہ پوری ہو یا نہ ہو اگر ایک خواہش پیدا ہو جاتی ہے تو چاہئے کہ اُسکے پورا ہونے پر دل کو خوشی اور راحت میسر ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا اور بیقرار دل کو آرام نہیں ملتا۔ خواہش کے پورا ہونے میں معاً اُس مطلوب سے ایک قسم کی سیری مائل بہ نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور تازہ خواہش نئے تیر و پیکان سے پیراستہ دل کو چھیدنا شروع کر دیتی ہے۔ فوراً انسانی قوٰے دوسری طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور اُس سابقہ خواہش کا پورا ہونا بالکل بے مزہ اور ادنے معلوم ہوتا ہے۔ ایک خواہش کے بعد دوسری خواہش کے وجود میں آنے کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اور یہی انسان کو محنت کرنے مصائب جھیلنے اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے پر تحریک اور تحریص کرتا ہے۔ یہی اُسکی کوششوں کو برابر جاری اور برقرار رکھتا ہے۔ اور یہی اُسکی زندگی کی مصروفیت کا سبب ہے۔

لیکن اس دوڑ میں سرگرم رکھنے والی صرف امید ہے۔ اگر اس امید میں ذرا بھی تزلزل ہو جاتا ہے تو کوششیں اُدھوری رہجاتی ہیں۔ دل

برداشت ہونے سے حرکت بند ہوجاتی ہے۔ اور آخر وہ حالت سکون پیش آتی ہے۔ جس میں ہاتھ پر ہاتھ رکھکر یا تو کسی غائبانہ امداد کی توقع کرنی پڑتی ہے یا خوشی سے اپنی بدقسمتی پر آنسو بہانے کی نوبت آتی ہے یہ آخری حالت انسان کی نہایت اضطراری حالت ہے اور اسی کا نام ناامیدی رکھا گیا ہے۔ جب کسی وقت انسان اس حالت میں مبتلا ہوتا ہے تو اسکے لئے دنیا میں خوشی کے راستے سب طرف سے بند ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ امید جو خوشی کی بشیر ہے اپنی آمد و رفت موقوف کردیتی ہے اور زندگی کا ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل اور وبال ہوجاتا ہے۔ تو متخیلہ بھی جسکا عمل اُمید کے ماتحت ہے کوئی دور نزدیک راحت اسکے لئے پیش نہیں کرسکتی۔ کوئی سامان اسکو اپنے دل کے مسرور کرنے کا نظر نہیں آتا۔ اس ناامیدی کا سیلاب جب ایک بدنصیب سامنے سے آتا ہوا دیکھتا ہے تو التجا کے ساتھ مایوسانہ لہجہ میں دفعتہً پکار اُٹھتا ہے ؎

سنبھلنے دے ذرا اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

بہت سے ایسے لوگوں کو جنھوں نے خودکشی کرکے دنیا کے مصائب سے نجات پائی ہے۔ بعض لوگ بزدل اور کمزور بتلایا کرتے ہیں۔ لیکن یہ بزدل بتلانے والے جواں مرد غالباً اس حالت سے آگاہ نہیں ہوتے اور نہ اُسکا اندازہ لگا سکتے ہیں جو ناامیدی کی حالت ہے۔ اگر یہ الزام لگانے والے اپنے دلیر دلوں میں کسی ایسے شخص کی حالت کا تصوّر کریں گے۔ جسکی ایک دلی آرزو پوری ہونے کی کوئی صورت نہو جسکو امید کی ڈھارس بندھانے والا چہرہ کسی طرف نظر نہ آتا ہو جسے در و دیوار سے مایوسی کی آوازیں آتی ہوں جس سے ہمدردی ظاہر کرنے والی کوئی زبان نہ ہو تو

وہ دیکھیں گے کہ وہ ایسا ایک شخص ہے جسکی حالت حقیقی طور پر قابلِ رحم ہے۔ زندگی اسکے لئے بے مزہ ہے۔ دنیا میں وہ رہتا ہے مگر دنیا سے اُسکو بہت دل بستگی ہے۔ جاننے پہچاننے والے اُس سے انجان بنتے ہیں۔ اور کوئی متنفس نہیں کہ اُسکے درد کا شریک ہو۔ ایک ایسے شخص کی زندگی یقیناً کوئی زندگی نہیں ہے اور وہ اپنی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ اور یہی خیال جب اُسکے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے تو وہ بار بار زبان سے کہتا ہے۔ "زندگی! یہ زندہ رہنے کے قابل نہیں" اور آخر وہ ایسے دیوانہ وار فعل کا مرتکب ہوتا ہے جسے صرف اُسکی حالت اور اُسکا دل جائز سمجھ سکتا ہے۔

اے وہ لوگو! جنکے دامن گل مراد سے بھرے ہوئے ہیں اے وہ لوگو! جنکی آرزوئیں کامیابی کے چشمے سے سیراب ہیں۔ تم خوش ہو! تمھارے چہرے بشاش اور منور ہیں۔ تمھارے لبوں پر تبسم ہے۔ اس لئے کہ تمھارے دل کا غنچہ اُس نا امیدی کے مُرجھا دینے والے جھونکے سے محفوظ ہے۔ جسکی ایک ہی لپیٹ اعضا کو نڈھال۔ چہرے کو زرد کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھوا کر بیٹھا دیتی ہے۔ جو دل میں وہ سوزش اور پژمردگی پیدا کرتی ہے جس سے دل کے بخارات سرد آہوں کی صورت میں نکلتے ہیں۔ خدا کا شکر کرو۔ اور اس مسرت کے وقت کو غنیمت سمجھو۔ اور خدا کرے تم اس بادِ سموم سے ہمیشہ امن میں رہو جسکے جھونکے مسرور سے مسرور دل کو افسردہ اور پژمردہ بنا دیتے ہیں۔ لیکن ان مجروح دلوں پر نہ ہنسو جنکو نا امیدی نے خستہ بنا رکھا ہے۔ وہ لوگ جنکی زندگی انکے لئے وبال ہے اور جو اس وسیع دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں پاتے جو اُن کے

مُرجھائے ہوئے دل کو ذرا شگفتہ کرے۔ وہ جنہیں سہارا دینے والی آس پاس کوئی چیز نہیں۔ وہ جو مایوسی کے اس درجے تک پہونچ گئے ہیں کہ جنہیں انسانی ہمدردی کا کوئی ثبوت نہ ملا اور اس بیکسی کی حالت میں وہ خدا پر بھی بھروسہ زائل کرکے اسکی رحمت سے دل شکستہ ہوگئے ہیں۔ اے کامیابی کے تاج پہننے والو! تم ایسی مخلوق پہ ہنسو نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنکو اُن کی غیرت اور حمیت نے موت سے بے خوف بنا دیا ہے جو اپنے ارادوں میں ایسے مستحکم ہیں کہ اپنی آرزوؤں پر اپنی جانیں قربان کرنا اپنی نجات سمجھتے ہیں۔ یہ ایسے غیرت دار دل رکھنے والے ہیں کہ کسی کے بارِ احسان اور مرہون منت ہونے کو اپنی زندگی سے بدتر جانتے ہیں بہرحال اے دنیا کی مسرت سے فیضیاب ہونے والو! تم ایسے لوگوں سے ہمدردی کرو۔ اُن پر رحم کرو یا کم از کم اُنکو اُن کے حال پر چھوڑ دو۔

اے وہ لوگو! جنکے ساتھ دنیا کی امیدیں وابستہ ہیں۔ اسکے وہ کہ تم سے توقعات رکھنے والے تمہاری طرف آس باندھے تک رہے ہیں۔ اسکے وہ کہ تم دوسروں کی مرادوں کو سرسبز کرنے والے ہو کیا تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ تمہارے دست نگر محتاج۔ اور امیدوار لوگوں کی خوشی تمہاری ذات پر منحصر ہے۔ اور اُن کے دل کی شگفتگی کی امیدوار کلی مُرجھا کر انکی زندگی کو کس قدر وبالِ جان کر دیگی۔ اگر وہ تمہارے تیور اپنی امیدوں کے خلاف برگشتہ دیکھیں گے۔ مایوسی کی گرم پلیٹ اس غنچۂ دل پر جو مسرت کا مخزن ہے کیا اثر کریگی۔ جسکی ترو تازگی حیات کے لیئے لابدی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ جن لوگوں کے دل افسردہ مجروح اور مایوس ہیں۔ زندگی اُنکے لیئے کوئی راحت نہیں رکھتی۔ صرف تنفس اُنکے لیئے عذاب ہے۔ اور وہ اپنا کام سوا اسکے

اس صورت کے کسی اور چیز میں نہیں دیکھتے کہ جس قدر جلد ہو اس دنیا کو خیرباد کہکر اس عذاب سے نجات پائیں۔

پس اے دلوں کی مراد برلانے والو! دیکھنا تم ایسے بڑے گناہ کے مرتکب نہ ہونا کہ اس دل کو مایوس کرو۔ جس نے اپنی خوشی اور راحت کو تم پر چھوڑ رکھا ہے۔ اے لوگو! اگر تمھارے سینوں میں دل اور دلوں میں احساس ہے تو کسی امیدوار دل کو نا امید نہ کرنا۔ سب کی بندھی ہوئی آس کو دانستہ یا نادانستہ طور پر یا اپنی بے پروائی سے خاک میں نہ ملا دینا۔ تمھارا ایک ادنیٰ فعل دوسرے کی خوشی پر بہت بڑا اثر ڈال سکتا ہے۔ پس اس امر کا خیال نہ رکھنا کہ ایسا گناہ عظیم تم سے کبھی سرزد نہو کہ وہ امیدوار جو ایک امید کے لئے تمھارے در پر آتا ہے اور خدا نے تمھیں اُس امید کے پورا کرنے کی مقدرت بھی دی ہے ایسا نہو کہ وہ دل شکستہ تمھارے پاس سے مایوس ہو جائے تم دوسروں کی کاربرآری کرو خدا تمھاری کاربرآری کریگا۔ اپنی زندگی کے ہر عمل میں اس بات کا ضرور خیال رکھنا کہ تم بھی دل رکھتے ہو۔ تمھارے دل میں بھی آرزوئیں اور امنگیں پیدا ہوتی ہیں اور ہونگی۔ اور تمھارا دل بھی کم و بیش امیدوں کا سرچشمہ ہے۔ ایسا نہو کہ تمھیں بھی وہ دن دیکھنا پڑے جو آج تمھارے تغافل اور لاپروائی سے دوسروں کو نصیب ہوا ہے۔ خدا نہ کرے کہ تمھارے شاد و خرم دل نا امیدی کی تلخی سے آگاہ ہوں۔

کون ہے وہ شخص جو اُس دل کی بیکلی سے آگاہ ہے۔ جسکی تمناؤں کا خون زمانے کے دستِ تظلم نے کیا ہے۔ اور جسے نا امیدی اپنی تاریک گھٹا سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جب وہ اپنے ایسے ہمجنسوں کو جو بعض باتوں میں اسکے برابر اور بہت سی باتوں میں اُس سے کم ہیں۔ کامیابیوں سے

سُرخرو دیکھتا ہے۔ تو جو رنج اُسکے دل کو کاٹتا ہے اور جو حسرت اُسکے سینے میں پیدا ہوتی ہے وہ ایسی ہے کہ اُسکی تکلیف اور اُسکے مزے سے کوئی نہیں کہہ سکتا (سوائے اُس مظلوم دل کے) کہ میں آگاہ ہوں۔

ہائے محرومی! تیری شکایت کس سے کیجائے۔ اور تجھے کیا کہکر الزام لگایا جائے۔ انسانی کوشش کو ضرور پھل لانا چاہیئے۔ مگر اُسوقت جب وہ بالائی طاقت جسے بعض تقدیر اور بعض اتفاق سے تعبیر کرتے ہیں۔ اُسکے موافق ہو۔ اور اگر نہیں۔ تو اے محرومی تقدیر! آ۔ آ۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے اور چل۔ جہاں تک تو مجھے لیجا سکتی ہے۔ لیکن دیکھ میری ایک حد مقرر ہے۔ اُس سے زیادہ دُور تو مجھے نہیں لیجا سکتی۔ موت کے سمندر کے کنارے پر پہونچکر میں تجھ سے بالکل آزاد ہوں۔ اور تیرا شکار جب چاہے تجھ سے آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ (لطیف احمد)

سوالات

۱۔ اگر انسان کے دل میں ایک امید کے پورے ہونے پر دوسری امید پیدا ہو جائے تو اُسکا کیا نتیجہ ہو؟
۲۔ ہر خواہش دلی کے انجام کیسی کس طرح ہوتے ہیں۔؟
۳۔ نا امیدی کی تعریف مصنف نے کیا کی ہے۔؟
۴۔ لوگوں نے کیوں خودکشی کے قبیح جرم کرکے اپنی جانیں دیں۔؟ تمھاری رائے اس معاملے میں کیا ہے۔؟
۵۔ خوشی کے وقت کو غنیمت سمجھنے کے متعلق تم کیا دلائل رکھتے ہو۔؟
۶۔ جو لوگ ایسے لوگوں کو جن سے اُنکو امیدیں ہیں اُنھیں امیدوں کے خلاف دیکھیں تو اُس سے اُنپر کیا اثر ہوگا۔؟
۷۔ کسی امیدوار کو نا امید کرنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔؟
۸۔ محرومی کا اثر انسان پر کیا پڑتا ہے۔؟

عزت

عزت ایک اچھا خیال ہے جو انسان کی خود اختیاری اچھی حالتوں

کے سبب سے اُسکی بڑائی کی نسبت دل میں پیدا ہوتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ حالتیں علمی ہوں یا عملی قولی ہوں یا فعلی۔ باطنی ہوں یا ظاہری۔ لازمی ہوں یا متعدّی۔ پس جو انسان جس قدر اپنی حالتوں کو درست کریگا۔ اور جتنا اچھے خیالوں۔ اچھّی باتوں۔ اچھّے کاموں۔ اچھّی عادتوں سے موصوف ہوگا۔ اُتنی ہی عزّت کا مستحق ہوگا۔

عزّت ہی وہ شے ہے جسکے حاصل کرنے کا شوق انسان سے بڑی بڑی سخت محنتیں کراتا ہے اور اُسے بڑے بڑے رنج دیتا ہے اور جب وہ حاصل ہو جاتی ہے تو انسان اپنی زندگی بڑی خوشی سے کاٹتا ہے۔ سارے رنج وغم بھول جاتا ہے۔ انسان مرجاتا ہے اُسکی ہڈیاں خاک ہو جاتی ہیں اُسکی خاک کا نشان بھی نہیں مِلتا۔ پر اُسکی عزّت نہ مرتی ہے اور نہ خاک ہوتی ہے۔ ہمیشہ قائم اور برقرار رہتی ہے اور درحقیقت موت کی گمنامی سے محفوظ رکھکر انسان کو زندۂ جاوید رکھتی ہے۔

عزّت درحقیقت ایک نتیجہ اچھے کمالات کا اور ایک ثمرہ عمدہ صفات کا ہے اِس لئے جب تک کوئی کسی کمال سے مکمّل اور کسی صفت سے موصوف نہو وہ عزّت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اور اِسی طرح جو اچھے کمال کا جامع اور اچھّی صفت سے متّصف ہو وہ عزّت کے استحقاق سے محروم نہیں رہتا۔

انسان کے اچھّے خیال اچھّی باتیں اچھّے کام عزّت کو ایسا کھینچ لیتے ہیں جیسا کہ مقناطیس لوہے کو یا کہربا گھانس کو۔ وہ کسی سے اپنی بزرگی و عزّت کا طالب نہیں ہوتا مگر لوگ خود بخود اُسکی عزّت کرتے ہیں۔ وہ کسی سے اپنی تعریف نہیں چاہتا۔ مگر سب اُسکی صفت خود کرتے ہیں کیونکہ انسان کی اچھّی حالتوں کا یہ قدرتی خاصّہ اور ذاتی تاثیر ہے جسے کوئی تبدیل نہیں

کر سکتا - پر جو شخص اچھے خیال رکھتا ہے - اچھی صفات کا جامع ہوتا ہے وہ خود اپنے آپ کو اچھا جانتا ہے - اپنی آپ عزت کرتا ہے - وہ مغرور تو نہیں ہوتا مگر اپنے آپ کو سچی عظمت میں جانتا ہے وہ کمینہ آدمی کی طرح جھوٹی شیخی تو نہیں رکھتا مگر ممدوح خودداری کا خیال رکھتا ہے - اُسکا دل اُس سچی عزت اور ممدوح خودداری کے سبب سے ایک پُر رعب شہنشاہ کے مانند ہوتا ہے جسے اپنی شاہنشاہی پر خود ناز ہو اسی واسطے وہ مخالفوں کے ذلیل کئے سے اپنے آپ کو ذلیل نہیں جانتا - دشمنوں کے حقیر کہہ دینے سے اپنی حقارت نہیں سمجھتا - اُسکا دل ایک سچے آبدار موتی کے موافق جوہری کا تو طالب ہوتا ہے مگر جھوٹے موتی کی جھوٹی چمک دکھانے سے اپنی بے آبروئی نہیں سمجھتا - وہ لعل بدخشانی کی طرح سلطانی تاج کی خواہش تو رکھتا ہے مگر کسی نادان مفلس کے پھینک دینے سے اپنی بے قدری نہیں جانتا - درحقیقت سچی عزت ایک قدرتی چشمہ کے موافق ہوتی ہے جسے کوئی خس و خاشاک روک نہیں سکتا - اور ایک روشن آفتاب کے مانند ہوتی ہے جسکی نورانی شعاعوں کو کوئی شپرہ چشم بند نہیں کر سکتا -

جو شخص کسی قوم میں ایسی عزت کا مستحق ہو وہ درحقیقت اُس قوم کا سہیل ہے جو اپنی قوم کے دلوں کو اپنے روشن خیالات کی برکت سے ساری غلاظتوں اور کثافتوں سے پاک و صاف کرکے ادیم یمنی کی طرح معطّر اور منوّر کر دیتا ہے یا وہ نسیم بہاری کی خاصیت رکھتا ہے کہ اپنے نرم لطیف فرحت افزا جھونکوں سے اپنے ملک کو باغ ارم بنا دیتا ہے - جس قوم میں کوئی ایسا شخص نہ ہو وہ خاروں کا ایک گلدستہ ہے جس میں کوئی پھول نہ ہو - یا ریت کا ایک چٹیل میدان ہے جسمیں کوئی بارور سایہ دار درخت نہ ہو - (نواب محسن الملک مولوی سیّد مہدی علی خان)

سوالات

۱- عزت کیسا خیال ہے اور اُسکے استحقاق کی نسبت تم کیا جانتے ہو-؟
۲- عزت حاصل کرنے کے لئے انسان کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے-؟
۳- عزت کا استحقاق کب حاصل ہوتا ہے-؟
۴- انسان کے اچھے خیال اچھی باتیں اور اچھے کام کیا کیا نتائج پیدا کرتے ہیں-؟
۵- قوم کے سپیل سے کیا مراد ہے؟

شہرت

شہرت کا خیال کیسا دل خوش کُن ہے- اِسکی آواز کیسی مسرت خیز ہے- اِسکی تمنا کیسی دلفریب ہے- کونسا دل ہے جس میں وہ جلوہ گر نہیں اور کونسا دماغ ہے جو اُسکے نام سے متاثر نہیں- شاہ و گدا امیر و غریب سب پر اُسکی حکومت یکساں ہے- ہر شخص کشادہ پیشانی سے اُن مصائب اور تکالیف کا مقابلہ کرنے کو تیار رہتا ہے جو شہرت حاصل کرنے میں اُسے پیش آتے ہیں- ہر شخص اُسکی آن پر جان دیتا ہے- اور ہر شخص کا یہی منشاء خیال ہے- بھلے اور بُرے سب اُس کے جویاں اور اُس کی تلاش میں سرگرداں ہیں-

وہ شریر لڑکا جو اسٹریٹ فورڈ میں ایک اُون بُننے والے کے گھر میں پیدا ہوا تھا- اور جسکے نزدیک چوری سے امیروں کے محفوظ جنگلوں میں سے ہرن کا شکار کرنا کچھ گناہ ہی نہ تھا- لندن میں پہونچکر ایک معمولی ایکٹر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے- اور وہ شہرت ہی ہے جس نے اُسکو ڈرامانویسی کا اُستاد- شاعر بے بدل اور ماہر بے مثال تمام سے منوا دیا- اور ایک معمولی ایکٹر کے درجے سے اُس مقام پر پہونچا دیا ہے- جہاں آجتک کوئی نہیں پہونچا- جو جذبات و خیالات اور جو اعلٰی شاعری اُسکے ناٹکوں میں

نظر آتی ہے۔ اُسکی نظیر کہیں دوسری جگہ نہیں ملتی۔ مگر یہ جو کچھ ہے۔ سب شہرت ہی کی کرشمہ سازی ہے۔

وہ معلم اوّل جو اپنے فخر زماں اُستاد سے بھی گوے سبقت لے گیا۔ شہرت ہی کی اداے شیریں کا بسمل تھا۔ شہرت نے اُسکو ایک غلط امتیاز سے دیکھا تھا۔ جسکو دیکھکر وہ وارفتہ ہوگیا تھا۔ نہ اپنی مفلسی کا خیال کیا اور نہ تکالیف و زحمت کا۔ اُسنے غلامی کو اُس آزادی پر جو پہلے اُسے میسر تھی ترجیح دی۔ اور وہ کام کرگیا۔ جسکا سکّہ آج تک دلوں پر جما ہوا ہے۔

وہ سیّاح فلاسفر جسکا نام بچّے سے لیکر بوڑھے تک کی زبان پر پایا جاتا ہے اور جو تمام دنیا میں اپنی حکیمانہ نصیحت اور اخلاقی مسائل کے لحاظ سے اپنا آپ ہی نظیر ہے شہرت ہی کی پُرفن آنکھوں کا شکار ہوکر آسمانِ بلندی پر آفتاب کی طرح چمکا ہے۔ شہرت ہی اُسکی سیاحت میں اُسکے ہمرکاب رہا ہے۔ اُسکو آگے بڑھنے کے لئے ہمّت دلاتی رہی ہے۔ اور تکالیف میں اُسکی غمخوار بنکر اُسکو خلعتِ بقاے دوام عنایت فرمایا ہے۔

وہ ناخدا جسکو مہینوں سمندر کی موجوں کے تھپیڑے کھاتے گذرگئے ہیں۔ جسکے ساتھی اُس سے بددل ہیں اور جو خود بھی کبھی کبھی عالمِ یاس میں پریشان نظر آتا ہے۔ اُسکا دل شہرت ہی بڑھاتی ہے اور اُسی کے خیال میں دنیا مافیہا سے بے خبر ہوگیا ہے۔ اور اِسی کے پیچھے وہ اپنے تمام مصائب بھول جاتا ہے۔ اور آخرکار نئی دنیا کا پتہ لگاتا ہے۔

وہ شاہزادہ جو اپنی بہادری کے سبب ایک ایسے عظیم الشان شہنشاہ سے جس پر ملک عجم فخر کرتا ہے لڑنے کے لئے میدان جنگ میں آتا ہے۔ اور کبھی ہند میں اور کبھی چین و رُوس میں اپنے جوہر مردانگی دکھاتا ہے یہ سب

کچھ یہی شہرت اُس سے کراتی ہے اور اُسکو ایک چھوٹے بادشاہ کے درجہ سے ہفت اقلیم کا شہنشاہ بنا دیتی ہے۔

وہ سپہ سالار جو میدان میں ہزیمت پر ہزیمت اُٹھاتا رہا ہے کیوں سینہ سپر ہے اور کیوں جان توڑ کر لڑتا ہے۔ اس لئے کہ شہرت کا خیال اُسکے دل میں ہے اور وہ اُسکو اپنے ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا۔

وہ موجد جو ہردم نئی ایجاد کی اُدھیڑ بن میں رہتا ہے اُسے شہرت ہی اپنے پیارے چہرے کی جھلک دکھاتی رہتی ہے۔ اور اسی کے حاصل کرنے کے خیال میں وہ وہ ایجادیں کرجاتا ہے کہ بعد مرگ بھی اُسکا نام صفحۂ دنیا پر باقی رہ جاتا ہے۔

وہ مصنف جو چاہتا ہے کہ اُسکے بعد اُسکا نام قائم رہے۔ کیسی دماغ سوزی اور جگر کاوی سے مضامین فراہم کرتا ہے صرف اس لئے کہ شہرت اُسکو حاصل ہو جائے۔

وہ شاعر جو نئے مضمون تلاش کرکے لاتا ہے شہرت ہی کے خیال میں مست رہتا ہے۔ اور اسی کو اپنا منتہائے خیال بنا کر آسمان ترقی پر چمکتا ہے۔ اگر وہ پورا شاعر نہیں ہوتا ہے تو کم از کم کسی خاص صنعت کو لے کر اُسی میں کمال حاصل کرتا ہے۔

وہ قومی بھلائی کا چاہنے والا جو ہر وقت قومی ترقی کے خیال میں مگن رہتا ہے۔ سچ پوچھو تو اُسکے دل میں شہرت کا جلوہ ہے۔ اور یہی اُسکو قومی بہبودی اور فلاح کے کاموں میں منہمک رکھتی ہے۔

مَیں جہاں تک سمجھتا ہوں شہرت وہ شے ہے کہ جب اُسکا خیال کسی کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے تو پھر وہ نکالے نہیں نکلتا۔ ہر کام میں

خاطر خواہ کامیابی اسی کی مدد سے ہوتی ہے۔ بلکہ اُسکا خیال ہی کامیابی کی دلیل ہے۔ (محمد یحییٰ تنہا)

سوالات

۱۔ شہرت حاصل کرنے کے لئے لوگ تکالیف کو کیوں آسانی برداشت کرتے ہیں۔؟
۲۔ شہرت نے ولیم شکسپیر کے ساتھ کیا سلوک کیا۔؟
۳۔ معلم اوّل کس شخص سے مراد ہے اُسکے کچھ حالات تحریر کرو۔؟
۴۔ سیّاح فلاسفر سے کون شخص مراد ہے اُسنے کیا کیا کیا۔؟
۵۔ کلمبس کی شہرت کے اسباب تحریر کرو۔؟
۶۔ شاہزادے سے کون بادشاہ مراد ہے۔؟
۷۔ سائنسدان۔ مصنف۔ شاعر۔ اور قومی بھلائی کا چاہنے والا کس غرض سے کام کرتا ہے۔؟

سچی مسرت

مسرت نہ روپیہ ہے نہ پیسہ ہے نہ عالی شان قصر و ایوان ہیں نہ خدم و حشم ہیں نہ حکومت و سطوت ہے۔ اِس لئے کہ اگر ان چیزوں سے حقیقی مسرت حاصل ہوتی تو ہم کسی بادشاہ و امیر کو ملول و افسردہ نہ پاتے اور اُن کے دل میں اور اُن کے اِس امیرانہ بلکہ شاہانہ دھوم دھام تمسا تک پہنچئے تو ہمارے غموں سے بڑے غم اور ہماری حسرتوں سے زیادہ حسرتیں موجود ہیں جس طرح ایک کوہستانی سلسلہ دُور سے کتنا نہایت مسطح ہموار نظر آتا اور دلچسپ معلوم ہوتا اور نزدیک سے جا کے دیکھو تو انتہا سے زیادہ غیر مسطح بہت ہی پُرخطر اور وحشتناک نظر آتا ہے اسی طرح اُسکے غریبی کی زندگی بسر کرنے والو! امیروں اور بادشاہوں کی سطوت و حشمت اور اُنکے عالیشان قصر و ایوان تمہیں دُور ہی سے عشرت و مسرت کے خانے نظر آتے ہیں۔ مگر اُنکے قریب جا کے خود اُن کی جگہ پہ کھڑے ہو کے اگر

اُنکی اصلی حالت کا اندازہ کرکے غور کرو تو صاف دیکھ لوگے کہ خوشی اور مسرت اُنکے اِس وسیع اور بڑے خزانے میں تم سے بھی کم اور بہت ہی کم ہے۔

اصلی خوشی ایک دلچسپ خیال سے عبارت ہے جو اکثر اُس دل میں زیادہ ہوتا ہے جس میں خواہشیں کم ہیں۔ جس قدر تم اپنی ضرورتوں کا دائرہ تنگ کرتے جاؤگے اُسی قدر تمھاری مسرت بڑھتی جائے گی۔ جس نے بڑے بڑے اور نہایت ہی عالی مرتبہ اور صاحب حکومت امیروں کو ادنےٰ طبقے کے مزدوروں اور مزدورنیوں پر حسد کرتے دیکھا ہے۔ یہ معمولی درجے کے لوگ جنھیں تم اپنے فضول اور بیہودہ غرور سے ادنےٰ اور کمتر اور حقیر اور ذلیل خیال کرتے ہو اُن کی حالت کا جب اندازہ کروگے تو عام طور پر انھیں اپنے سے زیادہ خوش پاؤگے۔ سعدی کے کلام میں اُس بادشاہ بن جانے والے فقیر کا یہ جملہ کہ "آں دم غم نانے بود واکنوں غم جہانے"۔ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اِن غریبوں کو فقط اتنی فکر ہے کہ قوت لایموت کے لئے دن بھر میں کچھ پیسے فراہم کرلیں جنکے حاصل کرنے کی کوشش میں وہ ہر قسم کی محنت کرنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ پھر اُس محنت کے بعد جب شام کو اپنے بی بی بچوں میں آکے بیٹھتے ہیں تو اُن سے زیادہ مسرور اور خوشحال کوئی نہیں ہوتا۔ اُن کی محنت اُن میں رات کے آرام کی قدر پیدا کرتی ہے اور اِس محنت کا حاصل کیا ہوا مختصر سرمایہ اُن کی فکریں دور کر دیتا ہے۔ اور یہ دونوں ایسی برکتیں ہیں جنکی بدولت روز شام کو انھیں وہ اطمینان اور فارغ البالی اور وہ خوشی و خرمی حاصل ہو جاتی ہے جو اُن سے زیادہ استطاعت رکھنے والوں کو کبھی زندگی بھر نہیں نصیب ہوئی۔

ان لوگوں کی حالت دیکھکر تمھیں بخوبی سبق مل سکتا ہے کہ اگر تم بھی اپنی فکریں محدود اپنی ضرورتیں کم اپنی خواہشیں دل سے نکال دوگے تو تمھیں بھی اصلی خوشی حاصل ہو جاویگی۔ اس لئے کہ اگر تمھیں حقیقت میں خوشی و مسّرت کی تلاش ہے تو اسی عمارت کے محل۔ سلطنت کے دربار اور ظاہری عیش و عشرت کی صحبتوں میں نہ ڈھونڈھو۔ بلکہ اُسے غریب کے جھونپڑے میں جاکے تلاش کرو۔ وہ وہیں ملے گی۔ اور اکثر وہیں رہتی ہے۔

اِس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ خدا کے خزانے میں خوشی کی کمی نہیں وہ وہاں کثرت سے موجود ہے۔ اور ہمیں کثرت سے مل سکتی ہے مگر خرابی یہ ہے کہ ہم میں کے اکثر لوگ اپنی ناسمجھی اور غلط خیالی سے اُسے ٹھیک جگہ جاکے نہیں ڈھونڈھتے۔ اُن کے دھوکا دینے کے لئے دنیا والوں نے شہوت پرستی کی صحبت کا نام محفلِ عیش رکھدیا ہے اکثروں کے خیال میں بسی ہوئی ہے۔ کہ خوشی صرف ناز و نعمت کے قصروں دولتمندی و تمکنت کے محلوں۔ اور حکومت و سطوت کے ایوانوں میں رہتی ہے۔ اور وہیں اُسکے ڈھونڈھنے کو وہ جاتے بھی ہیں جسکی بدولت طرح طرح کی ذلتیں اُٹھاتے ہیں مغلوب و مقہور ہوتے ہیں۔ جھوٹ بولنے اور خوشامد کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور اِن سب خرابیوں اور تباہیوں کے برداشت کرنے کے بعد غور کرتے ہیں تو اپنے دل میں خوشی کا نام و نشان بھی نہیں پاتے۔ اِس غلط راستے کو چھوڑ کے اگر غربت کے جھونپڑوں اور بے فکری کے چھپّروں کے نیچے دیکھیں تو وہ لعلِ بے بہا ضرور ہاتھ آجائے گا جسکے لئے انھوں نے دنیا کے بڑے بڑے عالی شان محل اور زبردست قلعے چھان مارے تھے۔

انسان جس وقت اور جتنی دفعہ اپنے دل میں یہ کہتا ہے کہ وہ یہ چیز ملنی چاہیئے" اُسی وقت اتنی ہی دفعہ ایک فکر اور اُسکے ساتھ ہی ایک غم اپنے لئے پیدا کر لیتا ہے۔ اگر یہ نہ کہے اور اِس جملے کے خیال سے اپنے دل کو بچالے تو بہت ہی جلد غم سامنے سے بھاگ جائے۔ اور وہ خوشی مل جائے جسے تباہی اور پریشانی کے ساتھ ذلتیں اٹھا اٹھا کے ہر طرف ڈھونڈھتا پھرتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں اور عام طور پہ مشہور ہے کہ "پیٹ کے لئے انسان ذلیل ہوتا ہے اور اُسی کی وجہ سے کبھی اطمینان نہیں نصیب ہونے پاتا" مگر غور سے دیکھو تو جس قدر سہل الوصول قوتِ لایموت ہے کوئی چیز نہیں۔ خدا نے چونکہ یہ ایک لازمی خواہش انسان میں پیدا کی ہے اسی وجہ سے اسکے دُور ہونے اور بھوک کی ضرورتیں رفع ہونے کا جتنا سامان خدا نے پیدا کر دیا ہے اور کسی چیز کا نہیں۔ یہ پیٹ کا دوزخ بھرنے کی خواہش پوری کرنے کے لئے ساری دنیا الوانِ نعمت کا ایک پُر تکلف خوان بنی ہوئی ہے اگر چاہو تو قدم قدم پہ پیٹ بھر سکتے ہو۔ بہت تھوڑی محنت اور بالکل معمولی درجے کی زحمت اُسکے لئے بخوبی کافی ہو سکتی ہے غریب اور امیر اور بادشاہ و وزیر کے روزانہ مصارف پر نظر ڈالو تو حیرت سے دیکھوگے کہ سب سے کم خرچ اُسی چیز میں ہوا جو صرف پیٹ بھرنے اور بھوک کی آگ بجھانے کے لئے تھا۔

تمھیں ذلیل کرنے والی اور زیادہ پریشان و سرگرداں بنانے والی عموماً وہی خواہشیں ہیں جنکو اس فطری تقاضے یعنی بھوک سے علاقہ نہیں۔ بلکہ وہی خواہشیں ہیں جنکو تم نے اپنی ہوس پرستیوں کے لئے

خود ہی تصنیف کر لیا ہے۔ اُن سے پیچھا چھڑاؤ۔ اُن کو دل سے بُھلاؤ۔ اور دیکھو کہ سچی مسرت اور بے غل و غش خوشی تمہارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔

(شرر)

سوالات

۱۔ مسرت سے کیا چیز مراد ہے اور وہ کب حاصل ہوتی ہے۔؟
۲۔ اصلی خوشی حاصل ہونے کے لئے کیا کیا شرائط ہیں۔؟
۳۔ اگر ہم اپنی خواہشوں کو محدود اور ضرورتوں کو کم کردیں تو کیا نتیجہ ہو۔؟
۴۔ ثابت کرو کہ خوشی کی کمی کے اسباب ہم خود پیدا کر دیتے ہیں؟
۵۔ فکر و غم کے اسباب کیا ہیں۔؟
۶۔ ثابت کرو کہ خوشی بہت سہل الحصول ہے؟
۷۔ ہوس پرستی چھوڑنے سے کیا کیا فوائد مترتب ہو سکتے ہیں۔؟

خطوط از موعظہ حسنہ

خط فارسی تمہارا پہونچا۔ میں تم کو چند بار فارسی کی طرف متوجہ کر چکا ہوں۔ اِسمیں کیا شک ہے کہ اُردو سے فارسی بدرجہا بہتر ہے۔ اتنی بات سمجھ لو کہ انگریزی۔ عربی۔ فارسی۔ یہ سب دوسرے مُلکوں کی زبانیں ہیں۔ ہمکو بلحاظ معاشرۃ اُردو کے علاوہ کوئی دوسری زبان درکار نہیں۔ لیکن اُردو ابھی حالتِ طفلی میں ہے۔ یعنی صرف ڈھائی تین سو برس اسکو پیدا ہوئے گزرے ہونگے۔ میر تقی۔ اور سودا کے اشعار میں بھی بہت سے الفاظ عجیب پائے جاتے ہیں۔ جو اب متروک و مہجور ہیں۔ جیسے جاگہ بجائے جگہ۔ ستی بجائے سے۔ اَنشیاں۔ بجائے آئیں وغیرہ۔ شروع میں بھاکا کے الفاظ اُردو میں اِس کثرت سے تھے کہ ابتدائی اُردو کا ایک جملہ سمجھ میں

نہیں آتا- سب سے پہلا اُردو کا شاعر یعنی ریختہ گو ولی تھا- اُسکے اشعار سنو تو ہنستے ہنستے لوٹ جاؤ- لیکن ہوتے ہوتے اُردو کی تہذیب ہوتی گئی- یہاں تک کہ میر تقی نے ایسا ریختہ کہا کہ فارسی کو مات کیا- سودا اُنکا ہمعصر تھا- ذرا بعد ناسخ و آتش کا زمانہ ہوا تو اُنکی بولی اور بھی صاف ہے- اب آخر میں شیخ محمد ابراہیم ذوق- حکیم مومن- میرزا غالب- اور دبیر و انیس لکھنوی نے اُردو کو تو خوب رونق دی- انگریز بھی کبھی کبھی تعجب کرتے ہیں- کہ اُردو کو رونق ہے مگر وہ سیکڑوں برس کے کام ہیں- غرض اُردو میں افسوس ہے کہ علم نہیں اور بول چول کا بھی وہ لطف نہیں جو عربی فارسی میں ہے-

بشیر- عربی کا جب تم کو مزہ ملیگا تو یقین و باور کرو آدمی پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے- مفتی صدر الدین خاں مرحوم کو میں نے دیکھا کہ بایں وقار عین امتحان میں انگریزوں کے روبرو گانے لگتے تھے- علم اور لطف زبان کی جست و جو میں ہم دوسری زبانوں کے حاجت مند ہیں- اور یہی وجہ ہے کہ نری اُردو سے کام نہیں چلتا- اور چار و ناچار دوسری زبان سیکھنی پڑتی ہے-

اب وہ دوسری زبان کونسی اختیار کیجائے جسکے ذریعے سے علم حاصل ہو اور بولی کا مزہ ملے- سنو برخوردار! وہ زبان انگریزی ہے- کلام الملوک ملوک الکلام (بادشاہ کا کلام کلام کا بادشاہ ہوتا ہے) انگریزوں کی جستجو انگریزوں کی تلاش و محنت اس درجے کی ہے کہ کسی قوم نے اس صفت میں انکی ہمسری نہیں کی- اب انگریزی کا یہ حال ہے کہ گنجینۂ علوم ہے یونانی اور عربی اور عبرانی اور سنسکرت اور لیٹن وغیرہ میں جو ذخیرے تھے انگریزوں نے سب اپنی زبان میں جمع کرلئے- اب یہ عجیب بات دیکھی جاتی ہے کہ اصلی زبان میں اُن علوم کا پتہ نہیں مثلاً جبر و مقابلہ

دراصل عربی میں تھا اُسکا نام الجبر اُسکا گواہ ہے انگریزوں میں کوڑیوں جبرو مقابلے ہیں۔عربی میں مجکو تو آج تک کوئی رسالہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔اور غالب ہے کہ مصر و رُوم میں بھی ہونگے تو اب انگریزی کتابوں کے ترجمے ہونگے اصلی کتابیں معدوم اور مفقود۔

اِس سے قطع نظر انگریزی زبان حکّام وقت کی زبان ہے۔اگر اِسمیں علوم نہ بھی ہوتے تو اُسکا زبانِ حکّام وقت ہونا کافی تھا کیونکہ اِس صورت میں وہ ذریعۂ رسائی ہے۔غرض جب جس پہلو سے دیکھا جاتا ہے سب سے مقدم انگریزی۔اُسکے بعد عربی۔اس لئے کہ وہ کلاسکل ہے۔فصاحۃ اور بلاغۃ اِس میں کُوٹ کوٹ کر بھری ہے۔سب کے بعد فارسی وہ بھی اِس وجہ سے کہ ہماری اُردو میں فارسی کی ترکیبیں بہت ہیں۔اور فارسی کے بدوں تکمیلِ اُردو ممکن نہیں۔حاصل کلام فارسی کو اتنا دیکھو کہ اصلی مطلب فوت نہ ہو۔یہ کون کہے کہ فارسی کچھ نہیں کسی چیز کا جان لینا اُسکے نہ جاننے سے بہتر ہے۔اگرکسی کو موقع ملے۔تو اُسکو سنسکرت اور ترکی اور پشتو اور چینی زبانوں کا سیکھنا تضیع وقت سے بہتر ہے۔تم تکمیلِ انگریزی پر اپنی تمام ہمت صرف کرو۔فارسی کو لہو ولعب کے عوض رکھو لیکن فارسی میں ہزاروں الفاظ عربی کے ہیں اُن کو نظر انداز مت کرو تحقیق عجب چیز ہے۔جو کرو تحقیق کے ساتھ کرو۔

اصلاح کے متعلق یہ بات ہے کہ مبتدی مثل اُس لڑکے کے ہے جو چلنا سیکھتا ہے اور اصلاح دہندہ اُس کو چلنا سکھاتا ہے ہم لوگ بچوں کو اُنگلی پکڑا دیتے ہیں۔لیکن چلنے کا سارا بوجھ لڑکے پر ڈالتے ہیں مگر فرض کرو کہ بجائے اُنگلی پکڑا دینے کے ہم لڑکے کو بٹھا دیں۔اور خود ساری

عبارت لکھدیں تو اُس سے مبتدی کو کچھ نفع نہیں- بڑی اصلاح شوق ہے- جی کو لگی ہوتی ہے تو آدمی وہ نکالتا ہے جو اُستاد کو نہ سوجھے-

بشیر! اگر تم چار پانچ برس لگ لپٹ کر محنت کر ڈالو تو کچھ بات نہیں- پھر انشاء اللہ تعالےٰ ساری عمر اِس محنت کا فائدہ اُٹھایا کروگے- میں نے جس بے سر و سامانی سے پڑھا تمھاری ماں اُسکی گواہ ہیں- انھیں سے پوچھو کہ مجھکو اطمینان سے سونا حرام تھا- یہ محنت ایک حیلہ ہو گئی- اور خدا نے مجھکو افلاس اور بے توقیری کے عذاب سے نجات دی- تم بھی تو کبھی اپنی حالت کو میری اِس حالت سے مقابلہ کیا کرو- اب جو میں سُست اور کاہل ہو گیا ہوں تو اس وجہ سے کہ کوئی اختیاری تدبیر باقی نہیں ورنہ اس پیری میں بھی میری کتاب بینی جوان ہے- بار بار امتحان وکالت کو جی للچاتا ہے لیکن بیس برس کی خدمت اور تعزز پر نظر کر کے ہمت قصور کرتی ہے- اب جو مجھ سے رہ گیا ہے تم کرو- (ع) اگر پدر نتواند پسر تمام کند* انگریزی کا انتظام ابھی خاطر خواہ تم نے نہیں کیا- گرامر کے قواعد مستحفظ ہوں- اور جو پڑھو سو ازبر- اصلاح دینے والا کوئی آدمی با استعداد ہو- اور ہر وقت ایک دُھن لگی رہے- تب جانو کہ انگریزی آگئی- اور انگریزی کی کیا تخصیص ہے- ہر علم کا یہی حال ہے-

(نذیر احمد دہلوی- ۲۱- مارچ سنہ ۱۸۷۶ء)

سوالات

۱- اُردو زبان کی عمر کب سے شمار کیجاتی ہے اُسکے مشہور شعرا اور متروکات کا کچھ ذکر کرو-؟

۲- عربی کا مزہ کب آسکتا ہے-؟

۳- انگریزی زبان کے متعلق مصنف نے اپنے خیالات کیا ظاہر کئے ہیں-؟

۴- انگریزی تمام زبانوں سے مقدم کیوں خیال کی جاتی ہے-؟
۵- عربی اور فارسی کی کس قدر ضرورت ہے-؟
۶- اصلاح سے کیا مراد ہے-؟
۷- مصنف نے بشیر کو کس طرح پڑھنے کی ہدایت کی ہے اور اپنے پڑھنے کا حال کس طور پر بیان کیا ہے-؟

خط ۳-

بیوی صاحب کو بعد سلام کے معلوم ہو- یہ بھی دنیا کا دستور قرار پاگیا ہے کہ جب کسی کا کوئی عزیز قریب مرجاتا ہے تو اسکی ماتم پرسی کیا کرتے ہیں میں تم کو یہ خط اس دستور کے مطابق نہیں لکھتا- کیونکہ مصیبت تنہا تم پر نہیں مجھ پر بھی ہے- میاں بی بی کا عجب رشتہ ہے کہ مرد و عورت نکاح کے ہو جانے سے دنیا کی سب چیزوں میں شریک ہو جاتے ہیں- یہ بات کسی اور رشتہ میں نہیں پائی جاتی- میرا تمھارا مال مشترک- گھر مشترک- کھانا- پینا مشترک- اولاد مشترک- آبرو مشترک- رنج و غم مشترک- اگر وہ لڑکی جیتی تو کیا تمھاری اکیلے کی بیٹی ہوتی نہیں میری تمھاری دونوں کی- پس، اگر مرگئی تو کیا تمھاری اکیلے کی بیٹی مری- نہیں میری تمھاری دونوں کی- پھر بھی میں اسکو تسلیم کرتا ہوں کہ تم کو اس سے بڑا قوی تعلق تھا- لیکن روحانی تعلق کی وجہ سے شاید جس دن وہ مری ہے میرا دل خود بخود بیقرار تھا- اور میں نے اسی گھبراہٹ میں میاں بشیر کو خط بھی لکھا- تاریخ ملا کر دیکھو غالب ہے کہ خط کی تاریخ اور اسکے مرنے کی تاریخ ایک ہوگی-

ظہیر- نصیر وغیرہ کے مرنے سے یہ تو بخوبی تجربہ کرچکے کہ موت پر انسان کا کچھ اختیار نہیں چلتا- رہا رنج وہ بھی رفتہ رفتہ کم ہو جاتا ہے- میں تم پر الزام نہیں لگاتا- اپنا حال بیان کرتا ہوں کہ نصیر کو کس قدر پیار کرتا تھا- اسکی

قبر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور میں سوتا بھی ہوں ہنستا بولتا بھی ہوں۔ دنیا کا کوئی کام مجھ سے نہیں چھوٹا۔ تو جب ظہیر نصیر کے رنج کو ہم نے چند سال میں بھلا دیا تو یہ لڑکی بیچاری کے دل کی تھی۔ آخر پھر دنیا اور دنیا کے کام۔ کتابوں میں بہت ٹھیک لکھا ہے کہ دانا اور احمق صبر دونوں کرتے ہیں۔ مگر فرق اتنا ہوتا ہے کہ احمق رو دھو کر چپ کرتا ہے اور دانا شروع سے خدا پر نظر کرکے چپ ہو رہتا ہے۔

غرض صبر تو آخر کرنا پڑے گا۔ پس کیا فائدہ کہ اپنا ثواب ضائع کریں دل کو مضبوط کر آنسو پونچھ سنبھل بیٹھو۔ خدا ہمارا مالک ہے۔ اُسنے دیا۔ اُسنے لیا۔ خدا کو ہم سے عداوت نہیں۔ بیر نہیں۔ جو کچھ کرتا ہے ہمارے نفع کے لئے کرتا ہے۔ لیکن اپنی کم فہمی کی وجہ سے ہم اُن مصلحتوں کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ دنیا کے انتظام پر نظر کرو۔ تو تندرستی۔ مال۔ اولاد و عقل و شرافت۔ دینداری۔ ہزاروں طرح کی نعمتیں ہیں اور یہ نعمتیں خداوند کریم نے اپنی مرضی کے مطابق لوگوں میں تقسیم کی ہیں۔ ہمکو بھی اُس نے اپنی رحمتوں میں سے بہت بڑا حصّہ عطا فرمایا ہے۔ تو کیا ہم ٹھیکہ دار ہیں کہ خدا کی سب نعمتیں اپنے گھر میں گھسیٹ کر بھر لیں۔ اور پھر اولاد سے بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے محروم نہیں۔ اُنکی عمروں میں خدا برکت دے اُن کو دین و دنیا کی فلاح ہو۔ کافی ہیں۔ اب زیادہ اولاد لیکر کیا کرو گی۔ اُنھیں پر اپنی محبت صرف کرو۔ اُنکے حق میں خدا سے دعائیں مانگو۔ اور مصیبت پر صبر کرو کہ خدا کی مرضی۔ شاید عاقبت میں انھیں مصیبتوں کے طفیل سے ہم پر رحم ہو۔ کسی اُستاد کا کیا اچھا قطعہ ہے ؎

قسمت کیا ہر ایک کو قسّامِ ازل نے ۔۔۔ جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا   غم ہمکو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

اے خدا ہم کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔ آدمی کو چاہئے کہ جب اُسپر کوئی مصیبت نازل ہو دوسرے بندگانِ خدا کے حال پر نظر کرے وہ پائے گا کہ ہزاروں آدمی اُس سے بدتر حالت میں مبتلا ہیں۔ بڑی ناشکری کی بات ہے کہ ہم لوٹ کردیں احسان اور چھوڑ دیں سلوک بھول جائیں۔ اور تھوڑے بھر رنج کی برداشت نہ کریں۔ بشیر بچہ ہے۔ تمکو روتے دیکھکر سہما جاتا ہوگا اُسکے حال پر رحم کرو۔ اپنے حال پر رحم کرو کہ کیا تمھاری حالت ہوگئی ہے۔ آخر یہ کالبدِ خاکی سدِ سکندر تو نہیں ہے۔ اِسی طرح رنجوں کے مارے اِسکو تحلیل کر ڈالوگی تو کیا انجام ہوگا۔

(نذیر احمد دہلوی - ۴ - جون ۱۸۶۶ء)

سوالات

۱۔ اولاد کی محبت میں والدین کی شرکت مصنف نے کس طرح سے ظاہر کی ہے۔؟
۲۔ مصنف نے موت پر انسان کے قابو ہونے کی نسبت کیا ذکر کیا ہے؟
۳۔ صبر کے لئے مصنف نے کس طریقے سے ہدایت کی ہے۔؟
۴۔ صبر کے لئے مصنف نے خدا سے کیا دعا مانگی ہے۔؟

رقعاتِ غالب

بنام منشی ہرگوپال صاحب تفتہ

صاحب! کیوں مجھے یاد کیا۔ کیوں خط لکھنے کی تکلیف اُٹھائی۔ پھر یہ لکھتا ہوں کہ خدا تم کو جیتا رکھے کہ تمھارے خط میں مولوی قمرالدین خاں کا سلام بھی آیا اور بھائی منشی نبی بخش کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوئی۔ وہ تو پینشن کی فکر میں تھے۔ ظاہرا یوں سنا سب دیکھا ہوگا کہ نوکری کی خواہش کی حق تعالیٰ جو اُن کی مراد ہو بر لاوے۔ اُنکو میرا سلام کہدینا بلکہ یہ رقعہ

پڑھوا دینا۔ مولوی قمرالدین خاں کو بھی سلام کہنا۔ تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پرسش کیوں کرتے ہو چار جزو ہوں تو بیس جزو ہوں تو بے تکلف بھیج دو۔ میں شاعرِ سخن سنج اب نہیں رہا صرف سخن فہم رہ گیا ہوں بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں کا ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا۔ شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھکر حیران رہ جاتا ہوں۔ کہ یہ میں نے کیونکر کہا تھا۔ قصہ مختصر وہ اجزا جلد بھیج دو۔ (غالب۔ یکشنبہ ۱۲۔ اپریل ۱۸۵۸ء)

سوالات

۱۔ مصنف نے اپنے آپ کو بوڑھا پہلوان کیوں بیان کیا ہے۔؟

ایضاً

آؤ مرزا تفتہ! میرے گلے لگ جاؤ۔ بیٹھو میری حقیقت سنو۔ یکشنبہ کو جو مولوی مظہرالحق آئے تھے۔ اُن سے سب حال معلوم ہوا۔ پہلا خط تم کو اُنکے بھائی مولوی انوار الحق نے بموجب حکم رنگش صاحب کے لکھا تھا۔ پھر ایک خط صاحب نے آپ مسودہ کرکے اپنی طرف سے تم کو لکھا دونوں دیوان تمھارے۔ نشترِ عشق۔ اور تذکرہ۔ اور یہ چار کتابیں تمھاری بھیجی ہوئی اُنکو پہنچیں صاحب تم سے بہت خوش اور تمھارے بہت معتقد ہیں۔ کہتے ہیں کہ "ہم جانتے ہیں اتنا بڑا شاعر کوئی اور ہندوستان میں نہ ہوگا۔ کہ جو پچاس ہزار بیت کا مالک ہو۔ فائدہ اس التفات کا یہ کہ تمھارا ذکر بہت اچھی طرح لکھیں گے۔ باقی ما بخیر شد بسلامت۔ فقط

(نجات کا طالب غالب)

سوالات

۱۔ گلے لگ جاؤ اور بیٹھو سے کیا مراد ہے۔؟

۲۔ پچاس ہزار بیت کا مالک کس سے مراد ہے۔ اور اسکا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔؟

بنام قاضی عبد الجلیل صاحب

جناب مولوی صاحب! آپکے دونوں خط پہونچے۔ میں زندہ ہوں۔ لیکن نیم مردہ۔ آٹھ پہر پڑا رہتا ہوں۔ اصل صاحب فراش ہوں۔ یہیں دنا سے پانوں پر ورم ہو گیا ہے۔ کفِ پا و پشتِ پا سے نوبت گذر کر پنڈلی تک آماس ہے۔ جوتے میں پانوں سماتا نہیں۔ بول و براز کے واسطے اُٹھنا دشوار ہے سب باتیں ایک طرف۔ دوا محلّل رُوح ہے۔ ۱۲۷۷ھ میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا۔ مگر اس تین برس میں ہر روز مرگ نو کا مزا چکھتا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں پھر کیوں جیتا ہوں۔ رُوح میرے جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل کوئی اختلاط۔ کوئی جلسہ۔ کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت۔ شعر سے نفرت جسم سے نفرت۔ رُوح سے نفرت۔ یہ جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقع ہے۔ مصرعہ محرّم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم ۔ ایسے مخمصہ میں اگر تحریر جواب میں قاصر رہوں۔ تو معاف ہوں۔ مجھے کیوں شرمندہ کیا۔ میں رسم ثنا و دعا کے قابل نہیں ہاں بزرگوں کا شیوہ ہے بُروں کو اچھا کہنا۔ اس مہر گستری کے عوض میں آداب بجا لاتا ہوں۔

سوالات

۱۔ مرزا نے اپنی حالت کیا ظاہر کی ہے؟ اور دعا و ثنا کی معذرت کیا کی ہے۔؟

بنام مرزا علاؤ الدین خاں صاحب

سُنو عالم دو ہیں ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گِل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے۔ لمن الملک الیوم اور پھر آپ جواب دیتا ہے للہ الواحد القہّار۔ ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ

عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوتا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ ۸۔ رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا۔ ۱۳ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی۔ اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا۔ اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد جیل خانے میں سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے۔ اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریزپا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار۔ مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں۔ سال گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ۔ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھئے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔ شعر

فرّخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم ‏ ‏ ‏ ‏ سوئے شہر خود ازیں وادی ویراں بروم

سوالات

۱۔ عالم ارواح اور عالم آب و گل سے کیا مراد ہے۔؟

۲۔ مصنف نے دنیا کو اپنے لئے قید خانہ اور کاروبار کو مشقت کیوں بیان کیا ہے۔؟

۳۔ مصنف نے اپنی موت کو قید سے رہائی پانے کے اسلوب میں کیوں ظاہر کیا ہے۔؟

بنام نواب انوار الدولہ سعید الدین خاں صاحب

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خداوند نعمت - آج دوشنبہ ۲۳ - رمضان کی اور ۱۵ - فروری کی ہے وقت صبح کا بارہ پر تین بجے ہیں عطوفت نامہ پہنچا - ادھر پڑھا ادھر جواب لکھا - ڈاک کا وقت نہ رہا خط کو سر بمہر رکھتا ہوں - کل سہ شنبہ ۱۶ - فروری کو ڈاک میں بھجوا دونگا - سال گزشتہ بہت سخت گزرا - بارہ تیرہ مہینے صاحب فراش رہا - اٹھنا دشوار تھا - چلنا پھرنا کیسا؟ نہ تپ - نہ کھانسی - نہ اسہال نہ فالج - نہ لقوہ - ان سب سے بدتر ایک صورت بکدورت یعنی احتراق کا عارضہ قصہ مختصر سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے - ہر پھوڑا ایک زخم ایک غار - ہر روز بے مبالغہ بارہ تیرہ پھائے - اور پاؤ بھر مرہم درکار - نو دس مہینے بے خورد و خواب رہا ہوں - اور شب و روز بیتاب - راتیں یوں گزری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی - تو گھڑی دو گھڑی غافل رہا ہونگا کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اٹھی - جاگ اٹھا - تڑپا کیا - پھر سو گیا - پھر ہوشیار ہو گیا - سال بھر میں سے تین مہینے دن یوں گزرے - پھر تخفیف ہونے لگی - تو تین مہینے میں ٹوٹ پھوٹ کر اچھا ہو گیا - گویا میرے روح قالب میں آئی - اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی - اب اگرچہ تندرست ہوں - لیکن ناتواں و شکستہ ہوں - حواس کھو بیٹھا - حافظہ کو رو بیٹھا - اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں جتنی دیر میں ایک قد آدم دیوار اٹھے - آپکی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سنا - خبر نہ لی - میرے مرگ کی خبر کی تقریباً و مثلاً میری یہ تحریر آدھی سچ اور آدھی جھوٹ در صورت مرگ نیم مردہ اور در حالت

حیات نیم زندہ ہوں۔ ؎

درکشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن   ایں کہ من ہمی میرم ہم ز ناتوانیہاست

اگر اِن سطور کی نقل میرے کرمفرما مولوی غلام غوث خاں صاحب بہادر میر منشی لفٹننٹ گورنری غرب و شمال کے پاس بھیج دیجیے تو اُن کو خوش اور مجکو ممنون کیجیے گا۔

سوالات

۱۔ مصنف نے اپنی علالت کا حال کیا کیا لکھا ہے؟

۲۔ مرزا کو بیماری سے کیا کیا نقصانات پہونچے؟

بنام خواجہ غلام غوث خاں بہادر بیخبر

جناب عالی! آج دوشنبہ ۳۰ جنوری ۱۸۶۵ء کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہوگا کہ ابر گھر رہا ہے۔ ترشح ہو رہا ہے۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔ بھوک کو کچھ بہت نہیں تاچار روٹی کھائی ہے۔ غمزدہ دردمند بیٹھا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ تمہارا خط لایا سرنامہ کو دیکھکر اس راہ سے کہ دستخط خاص کا لکھا ہوا ہے بہت خوش ہوا خط کو پڑھکر اس رو سے کہ حصول مدعا کے ذکر پر حاوی نہ تھا افسردگی حاصل ہوئی۔ اس افسردگی میں جی چاہا کہ حضرت سے باتیں کروں۔ باآنکہ خط جواب طلب نہ تھا۔ جواب لکھنے لگا۔ پہلے تو یہ سنئے کہ آپکے دوست کو آپ کا خط پہونچ گیا۔ مگر وہ دو بار مجھکو لکھ چکا ہے کہ مَیں جواب اسکا نشان مرقومۂ لفافہ کے مطابق ڈاک میں بھیج چکا ہوں جواب الجواب کا منتظر ہوں آپ جانتے ہیں کہ کمال یاس مقتضی استغنا ہے پس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ بامید مرگ جیتا ہوں۔ اس راہ سے کچھ مستغنی ہوتا چلا ہوں دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے ہر طرح گزر جائے گی

چاہتا ہوں کہ تم کو بھی آگہی کرتے کیا بکتا ہے مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے۔ پیام بھیجے
الہام سمجھئے چاہئے اوہام سمجھئے جتنے برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے

من کہ باشم کہ جاوداں باشم   چوں نظیری نماند و طالب مُرد
ورکسے پرسد کہ در کدامیں سال   مُرد غالب بگو کہ غالب مُرد

آپ چاہیں سو سمجھتے رہیں اور غالب مُرد کے بارہ سو ستتر ہیں اس عرصے تک جو کچھ مسرت پہنچتی ہو پہنچ لیے ورنہ پھر ہم کہاں۔

سوالات

۱- "پیٹ کو کچھ میسر نہیں" میں کیا کیا کہتے ہیں--؟
۲- غالب کو اپنے مرنے کا پہلے سے کیوں یقین تھا--؟

ایضاً

پیر و مرشد۔ یہ خط لکھنا نہیں ہے باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔ خلاصہ عرض کا یہ ہے کہ آج شہر میں پیدا نظیر نہیں ہیں اور کون لکھ دے گا۔ ناچار میں نے آپ کا خواہ شناس تو میرے نام بھیجا وہ اُن کے پاس بھیج دیا۔ انھوں نے رقعہ میرے نام کا آج بھیجا سو وہ رقعہ حضرت کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ قسم دوم کھراج کو کیا ہے۔ آپ اسکو سمجھ لیں۔ اور نگین با احتیاط ارسال فرما دیں۔ روپیہ بھیجنے کی ابھی ضرورت نہیں ہے۔ جب میں عرض کروں تب بھیجئے گا۔ تعجب ہے کہ جناب میر امید علی صاحب تعلق کا اس خط میں سلام نہ تھا۔ متوقع ہوں کہ جناب آپ کے تعمیدے اُن کو پہنچائیں اور میری بندگی کہہ دیجئے۔ جناب منشی نادر حسین خاں صاحب کو میرا سلام بعد ہزار اشتیاق کہئے۔

سوالات

۱۔ خط کا خلاصہ مطلب تحریر کرو۔؟

بنام حکیم سید احمد حسن صاحب مودودی

حضرت قبلہ! پہلے التماس یہ ہے کہ آپ سید صحیح النسب تمام امت محمدیہ کے قبلہ و کعبہ۔ جب آپ مجھکو قبلہ و کعبہ لکھیں تو پھر میں آپ کو کیا لکھوں۔ خدا کے واسطے غور کیجیے کہ قبلہ قبلہ اور کعبہ کعبہ یہ کیا ترکیب ہے چونکہ آپ نے مجھے استاد گردانا ہے اس التماس کو بھی از قسم اصلاح تصور کیجیے۔ زنہار۔ قبلہ قبلہ کبھی نہ لکھیے گا۔ یہ سوء ادب ہے۔ بہ نسبت قبلہ۔ خدا کی پناہ۔

آپ کا عطوفت نامہ پہونچا۔ میرے پہلے خط کا دیر پہونچنا اور اس کی دیر رسی کا سبب مجھکو معلوم ہوا۔ اب اسکا خیال رکھوں گا۔ یہ اب آپکو معلوم رہے کہ آپ کے کسی خط کا جواب میرے ذمہ باقی نہیں ہے جس خط کا جواب نہیں پہونچا اسکو یوں سمجھئے کہ وہ راہ میں تلف ہوئے اور میرے پاس نہیں پہونچے۔ فقط

(غالب ۱۹۔ ذی الحجہ)

سوالات

۱۔ مصنف نے القاب کے متعلق اپنی کسر نفسی کس پیرائے میں ظاہر فرمائی۔؟

۲۔ جواب خط کے متعلق مصنف نے کیا حاضر جوابی کی ہے۔؟

رقعات منشی غلام غوث بیخبر

مرزا اسد اللہ خاں غالب کے خط کا جواب

حضرت! خدا گواہ اور محبت شاہد ہے کہ ہمیشہ آپکے خطوں کے لئے اپنا جیلا تڑپایا کیا۔ اکثر آپ کو یہ لکھنا چاہا کہ جب تک میں زندہ ہوں مجھ سے تو سلسلہ تحریر

قطع نہ کیجئے اس محبت کو تا دمِ آخر نباہ دیجئے۔ لیکن آپ کے ضعف کا حال جو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر بعضوں سے سُنا کہ آپ آپ نے خدام سے فرما دیا ہے کہ کوئی کاغذ ہو مجھے دکھایا ہی نہ کرو۔ اس سبب سے تحریر کی جرأت نہ کر سکا۔ دل پر جبر کر کے بیٹھ رہا۔ اب جو آپ کا عنایت نامہ آیا نہیں کہہ سکتا کہ کیسی خوشی ہوئی۔ دولت ملتی۔ سلطنت ہاتھ آتی۔ تو بھی شاید اتنی خوشی نہ ہوتی۔ ان چند سطروں کو بار بار پڑھا کیا۔ دیر تک ایک کیفیت قلب پر طاری رہی جو بیان میں نہیں آسکتی۔ قسموں کی کیا حاجت ہے۔ اگر اتنا بھی معلوم ہو کہ میرے دس خط کا ایک جواب آئیگا تو حضرت کے دیوانخانے کا طاقچہ میرے خطوں سے بھر جائیگا۔

آپ کو نئے حاکم کا خیال آیا ہوگا جو سا خدمت روز گار سے استعفار ہے۔ واقعی انکی خاوندیوں میں شک نہیں۔ مگر طالع تو وہی پرانا ہے۔ کیا عرض کروں میرے حال نے فلسفیوں کا کلیہ باطل کر دیا۔ کہ با وجود حادث ہونے کے متغیر نہیں۔ اس سال روہیلکھنڈ کا دورہ ہوتا ہے۔ کل تک لشکر رام پور کے علاقہ میں تھا۔ آج بریلی کی حد میں داخل ہوا۔ زندگی باقی ہے تو پانچویں فروری کو یہ دورہ ختم ہوگا اور الہ آباد پہونچیں گے۔

سوالات

۱۔ کاتب نے مکتوب الیہ کے خطوط کے متعلق اپنا اشتیاق کس طرح ظاہر کیا ہے۔؟
۲۔ مصنف نے اپنی طبیعی بدقسمتی کو کس پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔؟
۳۔ مصنف نے دورے کی کیا خبر دی ہے؟

حکیم وجیہ الدین صاحب کے خط کا جواب

قبلہ عاشق دلفتنا چھوٹ ست دیتے حکیم صاحب فقیر کا مشرب اکثر

بلکہ خدا جھوٹ نہ بلائے تو سارے معاملات میں ارباب زمانہ کے مشرب سے
جدا ہے - میرے ہاتھ سے اگر کسی کو کچھ پہونچتا ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اُسکی
امانت میرے پاس تھی میں نے پہونچا دی - اور بہت شکر کرتا ہوں کہ اُس
خدائے کریم نے آپ دیا اور میرے ہاتھوں سے دلواکے مفت میں مجھے
نیکنام کیا - اگر کسی اور کے ذریعے سے دلواتا اور یہ نیکنامی اُسکے حصّے میں جاتی
تو میرا کیا زور تھا - یہ ہرگز نہیں تصوّر کرتا کہ میں نے احسان کیا اور احسان کا
تو جب خیال کروں کہ میں اپنے پاس سے کچھ دوں - اپنے پاس سے جب
دوں کہ کوئی چیز میری مِلک میں ہو - میں دنیا کی کسی شے کو اپنی نہیں جانتا -
اور کیونکر جانوں کوئی چیز میری ہوتی تو عدم سے آتے وقت ساتھ لایا ہوتا
دنیا سے جاتے وقت ساتھ لیتا جاتا - نہ وہ ہوا نہ یہ ہوگا - پھر یہ مِلک کیسی
اور میں مالک کیسا - کچھ نہیں جو یہاں کی چیزوں کو اپنا جانتے ہیں
بڑی غلطی میں پڑے ہیں - حقیقت یہ ہے کہ چند روز جو اس عالم کی سیر
کی اجازت ہوئی ہے رفع ضرورت کے لئے کچھ چیزیں بھی عاریت
دیدی گئی ہیں - مالک کو اختیار ہے - جب جو چاہے اُس میں سے
دوسرے کو دلوادے - ہمیں اس میں کیا دخل - فرد

در حقیقت ہمہ زمِلک خدا است   چند روزے بعاریت با ماست

اس امر کو کیا سمجھیں - یہاں کی مستعار چیزوں کو مِلک قرار دیں - اُس
بے اختیاری کو جو اُس کے دینے میں ہے اختیار تصوّر کریں پھر اُسکا
احسان رکھیں - لاحول ولا قوۃ - ع بریں عقل و دانش بباید گریست
دعا کیجئے کہ خدا انجام کار تک فقیر کی سمجھ کو ایسی ہی رکھے اور نفس
کے دھوکے سے بچائے -

سوالات

۱- احسان کے متعلق مصنف کی کیا رائے ہے -؟

۲- دنیا کو ناپائدار ثابت کرنے میں مصنف نے کیا نازک خیالی کی ہے -؟

رائے سالگ رام صاحب انسپکٹر کے نام

مظہر الطاف وکرم سلامت - جب یہ امر متحقق ہے کہ عالم ارواح میں روحوں سے باہم دگر ملاقات ہوئی ہے تو میں یہ کیوں کہوں کہ میرے آپکے سابق کی ملاقات نہیں - باقی رہا یہ امر کہ جب تک عالم اجسام میں ظہور اسکا نہو تب تک کسی کو کسی بات کی تکلیف دینی بے موقع ہے اسکو میں بھی تسلیم کرتا ہوں مگر عالم اسباب میں بعض وقت ایسے سبب جمع ہو جاتے ہیں کہ وہ بے مراسم ظاہری بھی تکلیف دینے پر جرأت دلاتے ہیں - مجھے اسپر جرأت دلانے والے دو امر ہیں - ایک آپکا صوفی مشرب ہونا - چونکہ میں بھی ابتدا سے عمر سے حضرات صوفیہ کا خادم ہوں یہ مناسبت اپنے میں اور آپ میں ایسی پاتا ہوں کہ سارے تکلفات کو قطع کرنے کے لئے کافی ہے - دوسرا یہ خیال کہ جب آپکو خط دیکھکر یہ تصور ہوگا کہ ظاہری شناسائی نہیں ہو تو بیعت دیتا ہے تو میری سادہ دلی پر رحم آجائیگا - اور وہ رحم میرے مقصد کے پورا ہونے میں برسوں کی ملاقات سے زیادہ کام دیگا - پھر بے تکلف آپکو تکلیف کیوں نہ دوں - اس لئے گزارش کرتا ہوں کہ آپکو یاد ہوگا آپکے پنشن لیتے ہوئے جب آپ الہ آباد تشریف لائے تھے تو منشی نثار علی بیگ صاحب نے آپ سے انکی سفارش کی تھی کہ امین الدین خاں صاحب سب انسپکٹر کو فتحپور سے الہ آباد بدل دیجئے - اور آپ نے وعدہ فرمایا تھا اگرچہ مرزا صاحب بھی مثل میرے صاحب کے دوست ہیں - لیکن تحریک اسکی میری ہی تحریک سے

ہوئے تھے۔ اب میں بلا واسطہ ملتمس ہوں کہ اپنے وعدے کو وفا فرمائیے۔ اس عطا میں زیادہ لطف ہے جو بے تکلیف انتظار ملے۔ آپ سے میں اسی کا خواستگار ہوں۔ اور کیوں نہوں کہ ارباب کرم کے نزدیک یہ کچھ دشوار نہیں۔ اگر تھوڑا سا وقت آپ اس تحریر کے جواب میں بھی ضائع فرمائیں گے تو میں اسکا بھی شکر گزار ہونگا۔

سوالات

۱۔ کاتب نے مکتوب الیہ سے باوجود پہلی ملاقات نہونے کے کس اسلوب سے قدیمی تعلقات ظاہر کئے ہیں۔؟

۲۔ اس عطا میں زیادہ لطف ہے جو بے تکلیف انتظار ملے۔ سے کیا مراد ہے۔؟

منشی محمد اکرام حسین صاحب منصرم کالکٹری کے نام

مخدوم میرے۔ اگرچہ حاجت روائی خلق اللہ کی ہے تو بہت اچھی بات کہ انسان دنیا میں نیکنام رہتا ہے۔ عقبیٰ میں مغفرت سے شاد کام ہوتا ہے۔ ہر شخص تسلی درج کرتا ہے۔ ہر ایک اسکا دم بھرتا ہے۔ بے کوڑی پیسہ خرچ کئے فدائیوں کا لشکر اسکے لئے تیار رہتا ہے جب تک جہاں میں رہے سب عزیز رکھتے ہیں۔ کہیں چلا جائے تو بخیر یاد کرتے ہیں۔ لوگ رنج و راحت میں اسکے شریک ہوتے ہیں۔ جو کہ ظاہر میں دور ہوں وہ بھی دل سے نزدیک ہوتے ہیں۔ جیسے کہ آپ ہیں۔ اور لطف بھی دنیا میں رہنے کا یہی ہے کہ سویدا کی طرح لوگوں کے دل میں رہے سب کی آنکھوں میں جگہ پائے۔ نگار کی صورت تن میں رہے۔ مگر بڑی آسیب ہے تو یہ ہے کہ لوگ تنگ بہت کرتے ہیں انگلی پکڑ کر پہنچا پکڑتے ہیں۔ جسکا ایک کام کردیا وہ دوسرا کام پیش کرتا ہے۔ ہر وقت ایک نئی طرح کی تکلیف دیتا ہے۔ جیسا

میں ہوں کہ آج پھر آپ کو کچھ تصدیع دیتا ہوں اس اجمال کی تفصیل
ہے کہ میاں محمد سعید میرے ایک دوست اُس ضلع کی پولیس میں نوکر
ہیں بہت دنوں سے اُنکی شادی ٹھہری ہے - دونوں طرف سارا سامان مہیّا
ہے - اُنھیں کسی طرح رخصت نہیں ملتی - اگر آپ وہاں کے صاحب سپرنٹنڈنٹ
بہادر سے اتنا کام لیں کہ اُن کو دو مہینے کی رخصت بلا عوض یا معاوضہ جیسی
مل سکے دلا دیں تو کمال آپ کا احسان ہوگا -

سوالات

۱ - حاجت روائی خلق اللہ کے نتائج بیان کرو اسکے فوائد اور نقصانات کی تفصیل کرو - ؟

قاضی نجم الدین صاحبؒ کے خط کا جواب

ساری ہستی حباب کی سی ہے یہ نمایش سراب کی سی ہے

آج صبح کو کرشامِ غم اُسے کہوں تو بجا ہے آپکا خط آیا - کیا لکھوں - دل نے
کیا صدمہ اُٹھایا - مجھے اس سرگذشت کے تصور سے رنج و الم ہے - آپ پر
گذری ہے جو کچھ آپ کی حالت ہو کم ہے - کوئی ناسمجھ ہو تو اُسے سمجھاؤں
کہ دنیا ناپائدار ہے - زندگی کا کیا اعتبار ہے - ہم سب اس بزم میں اسی لئے
جمع کئے گئے ہیں کہ پریشاں ہوں - ایک کا حال دوسرے کے لئے آئینہ
ہے - پھر کیسے نکر نہ حیران ہوں - غفلت ہم لوگوں کا شعار ہے - اور جو سچ
پوچھئے تو اس میں بھی کچھ اپنا قصور نہیں - اس کارخانے کا اسی پر مدار
ہے - ورنہ سوچیں تو دنیا ایک طلسمات کی سرا ہے - مسافر اس میں
پس وپیش آتے ہیں - اور ویسے ہی اپنے اپنے وقت پر چلے جاتے ہیں چند
ساعت جو دم لینے کے لئے ٹھہرتے ہیں تو عبث کن کن جھگڑوں میں

پڑتے ہیں ناحق کے لاکھوں تعلق ہیں کروروں افکار ہیں اختیارات کو حقیقت سمجھ لیا ہے اسی سے مبتلا ہے آزار ہیں۔ جانے والے جو دامِ غفلت سے نکل جاتے ہیں پھر وہ ہمیں مڑ کر نہیں دیکھتے کہ ان کا کیا حال ہے۔ ہم جب تک اس میں پھنسے ہیں مجبور ہیں ہمیں اُن کا رنج ہے ملال ہے۔ آپ تو خود سمجھدار ہیں۔ دس اور کو سمجھا سکتے ہیں۔ آپکو کیا سمجھاؤں۔ ہاں دعا کرتا ہوں کہ پروردگار مرحومہ کو حضرت خاتونِ جنت کے جوار میں جگہ دے۔ آپکو توفیق صبر عطا کرے۔ لڑکی کی عمر دراز ہو کہ وہ موئی ہٹی کی نشانی ہے۔ پس ماندوں کے لئے مرہمِ زخمِ جاودانی ہے۔

سوالات

۱۔ مصنف نے دنیا کی ناپائداری کے لئے کیا دلائل پیش کئے ہیں۔؟

۲۔ تلقین صبر کے لئے مصنف نے کیا تحریر کیا ہے؟۔

نواب محسن الملک کے بھائی کی تعزیت میں

جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔ اللہ اکبر پہلو میں جگر ہے یا پتھر کہ جس کے قتلِ صحت کی تہنیت لکھنے کا منتظر تھا اُسکی تعزیت لکھنے بیٹھا ہوں اور قلم ہاتھ سے گر نہیں پڑتا۔ سینے میں دل ہے یا فولاد کہ زمزمۂ شادی کی جگہ نوحۂ غم لب پر لاتا ہوں اور اُسکے خون ہو کر بہ جانے سے نہیں ڈرتا۔ بھائی اور جوان اور ذی استعداد اور خوش لیاقت۔ ایسے کے مرنے میں کیونکر لکھوں کہ رنج اختیار نہ فرمائیے۔ دل پر جبر کیجئے۔ مرنے والے کی اچھی باتوں سے کس کس بات پر کہوں کہ بے صبری اچھی نہیں صبر کیجئے۔ اُس حادثہ کا جس قدر آپ کو الم ہو کم ہے۔ تمام عمر جیو دل کو چین نہ لینے دے وہ کم ہے۔ مگر کیا کہوں اگر یہ نہ کہوں کہ گریہ و بکا بے سود ہے۔ جی مانے یا نہ مانے تسلیم و

رضا ہی میں بہبود ہے- اور میں کیا کہوں آپ خود جانتے ہیں کہ دنیا فانوس خیالی ہے- انسان اسمیں مثل تصویر کاغذی ہر امر میں اپنے اختیار سے خالی ہے جسے زندگی کہتے ہیں وہ ایک حرکت اضطراری ہے- اور جسے موت جانتے ہیں وہ ایک سکون بے اختیاری ہے جب یہ حال ہو تو جینا- مرنا- سب ایک سا ہے تصویر کو تصویر کا غم کرنا بیجا ہے- اگر اصل حقیقت پر آدمی کی نظر ہو تو پھر کیوں ایک کے لئے دوسرا خاک بسر ہو لیکن ہاں انصاف یہ ہے کہ اسمیں بھی کچھ اپنا بس نہیں چلتا- اس طلسم غفلت کا اثر ایسا غالب ہے کہ دل سے ہرگز نہیں نکلتا- بہرکیف آپ بیدعا ہے کہ مرحوم کی مغفرت ہو اور اسکے بعد جو کچھ آپکو پیش آئے وہ سب عیش وعشرت ہو فقط

سوالات

۱- مصنف نے تلقین صبر اظہار افسوس- ناپائداری دنیا اور دعاے مرحوم کے لئے کیا کیا پیرائے اختیار کئے ہیں؟

قصائد

قصیدہ- لغت میں قصیدہ کے معنی ہیں کسی شخص یا چیز کی جانب متوجہ ہونا- چونکہ قصیدہ میں شاعر کا مقصود کوئی خاص شخص یا چیز ہوتی ہے جسکی بھلائی یا برائی کرتا ہے اس لئے اسکو قصیدہ کہتے ہیں- قصیدہ میں اگر بھلائی یا برائی سے پہلے کوئی تمہید ممدوح کے حال کے موافق ہو تو اسکو تمہیدیہ کہتے ہیں اور اگر شروع ہی سے تعریف شروع کردیجائے تو اسکو خطابیہ کہتے ہیں- قصیدہ یا غزل کا پہلا شعر جسکے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہو اسکو مطلع کہتے ہیں- مطلع کبھی ایک ہوتا ہے کبھی دو یا زائد- اور مطلع کے بعد کے شعر کو حسن مطلع- اور شعر آخر کو جس میں شاعر اپنا تخلص رکھتا ہے مقطع کہتے ہیں- قصیدۂ تمہیدیہ کے اس شعر کو جس سے ممدوح کی تعریف کی جانب رجوع کریں- گریز یا مخلص کہتے ہیں- اور اس تمہید کو تشبیب- جو الفاظ حرکات سکنات وزن تعداد حروف میں یکساں ہوں انکو قافیہ اور جو تمام اشعار کے آخر میں مکرر آئے اسکو ردیف کہتے ہیں-

حمد باری تعالے

ہر جا ہے تیرا جلوہ لیکن   دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا

یاں عقل ہے گم کہ بس تجھی کو | پایا ہر شے میں پر نہ پایا
اللہ رے تیری بے نیازی | یعقوب کو مدتوں رُلایا
یوسف سے عزیز کو کئی سال | زندانِ عزیز میں پھنسایا
یاں شعلہ کو سرکشی کی کیا تاب | ابلیس کو خاک میں ملایا
تجھکو ہی سزا ہے کبریائی | کرسی کا نہ عرش کا یہ پایا
تو واحد و بے نظیر و ہمتا | تو حاکم و خالقِ برایا
تجھکو بھی نہ کہہ سکیں ترا مثل | یاں تک کہ نقشِ دوئی مٹایا
یعنی وہ فنا ازل سے ہے اور | اُس ذات کو کب زوال آیا
آوے تری حمد کا تو ہم | یہ حوصلہ میں کہاں سے لایا
کیا صعب گزار ہے رہِ حمد | جبریل کا پانوں لڑکھڑایا
چکر میں ہے عقلِ عرش اعظم | اُس نے بھی مگر تجھے نہ پایا
مومن ہے زمانِ عرضِ احوال | یعنی تجھے بے خبر و جتایا
تر ہو مژہ کے دعا کر اک ذرا دیکھ | کیا ابرِ کرم ہے سر پہ چھایا
اللہ مرے گناہِ بیحد | وہ ہیں کہ شمار کو تھکایا
ہے عام خطاب یا عبادی | اُسنے تو مجھے آسرا بندھایا
عالم میں نہ ہوئیگا وگرنہ | مجھ سا کوئی منکر التجایا
کیونکر نہ ہو تیری آس تونے | افلاک کو بے ستون تھمایا
مجھکو بھی بچالے جیسے تونے | یوسف کو گناہ سے بچایا
وہ رفعتِ حال دے کہ جس نے | منصور کو دار پہ چڑھایا
اسکا مرے دل پہ ایک پرتو | جس شعلہ نے طور کو جلایا
مومن کہے کس سے حال آخر | ہے کون ترے سوا خدایا

(مومن)

زمانہ کا انقلاب

یادِ ایامِ عشرتِ فانی — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں — گھر نہیں اپنے گھر کی ویرانی
ایسے وحشت سرا میں آئے کون — بے زری کر رہی ہے دربانی
نکتہ سنجوں سے جی میں ہے پوچھوں — کہ میں شہری ہوں یا بیابانی
کیا ہوئی وہ بلندیِ دیوار — کیا ہوئے وہ عرض و طولانی
مٹ گئے حوض و نہر نیز از چشم — ایک قطرہ کہیں نہیں پانی
نہ رہا کچھ نشانِ آبِ رواں — خاک سارے جہان کی چھانی
سقفِ رنگین و زرنگار کہاں — جس پر سپہر و نجوم نورانی
شورِ زاغ و زغن ہے گوش خراش — اب کہاں بلبل و غزلخوانی
صرفِ دلقِ گدا ہوئے پردے — زینت افزائے کاخِ سلطانی
آپ کا شانہ فرشِ خاک ہوا — کیسے قالیچہ ہائے کاشانی
یا ظروفِ سفالہ سے مجھے تھا — دعویِ قیصری و خاقانی
یا نہیں ہے مرقع و کشکول — تا کروں تازہ رسمِ ساسانی
مسندِ گوہریں کا دھیان آیا — پوچھتے کیا ہو وجہِ گریانی
بالشِ سنگ و خواب واویلا — بارِ خاطر ہوئی گراں جانی
یا ہیاں پرنیان و اطلس تھے — جامہ گر تھی سپہر سامانی
یا یہ احوال ہے کہ چاک ہوا — تنگیوں سے لباسِ عریانی
اس چمن زار کو خزاں سے ہے گرد — میں نے کیا تہ کی بات پہچانی

(س ش)

قصیدۂ مدحیہ

پائے نہ ایسا ایک بھی دن خوشتر آسماں
کھائے اگر ہزار برس پیچ کر آسماں

دیکھے نہ اس طرح کا تماشا جہان میں
گر ہو تمام چشم تماشا گر آسماں

اظہار با ہے عطر سے عیش و نشاط کے
سچ ہے نہیں ہے پاؤں رکھے کیونکر آسماں

افراط انبساط سے ہے کیا عجب اگر
مثل حباب جامہ سے ہو باہر آسماں

شادی کی اسکی دھوم ہے آج آسمان تلک
تاریخ زمانہ جسکا ہے فرماں بر آسماں

فرزند شاہ یعنی جواں بخت ذی وقار
تسلیم کرے ہے جسکی جھکا تا سر آسماں

ہے اسکی بارگاہ میں مانند چوبدار
واعنز تھامے کاہکشاں لیکر آسماں

اس بیاہ کی نوید سے ہے اس قدر سرور
ہے پیر پر جوان سے ہے بہتر آسماں

پھرتا ہے اہتمام میں شادی کے رات دن
مقدور کیا ہے ٹھہر سکے دم بھر آسماں

فرد حساب صرف ہے اس بیاہ کے ہو قلم
گو لاکھ جمع و خرچ کا ہو دفتر آسماں

ابر بہار و دود چراغاں سے تو بہ تو
ہوں سات آسماں کی جگہ ششتر آسماں

چشم قمر میں اور بھی ہو روشنی دو چند
کاجل لگائے اسکے دھوئیں سے گر آسماں

کرتا رہا برات کی شب شام سے نثار
شبنم کی جا ہے صبح تلک گوہر آسماں

پہونچے براتیوں کے نہ ہرگز ہجوم کو
انجم سے لاکھ جمع کرے لشکر آسماں

جس وقت سہرہ باندھ کے دولھا ہوا سوار
کیا کیا بلائیں لیتا تھا جھک جھک کے آسماں

ایسا نہیں جہاں میں کوئی نخل آرزو
لایا ہو آج جس میں نہ برگ و بر آسماں

کرتا ہے شاخ خشک تمنا کو نخل سبز
در پردہ مثل پردہ بازی گر آسماں

شادی کا اسکے نور بصر کی ہے اہتمام
کرتا ہے جس کا روز طواف در آسماں

وہ شاہ نامور کہ بہادر شہ اسکا نام
ہو حکم سے نہ اسکے کبھی باہر آسماں

* مطلع پڑھوں حضور میں وہ میں جسے کہے
مطلع سے آفتاب کے بھی برتر آسماں

مطلع

تجھ سا زمیں پہ دیکھے جو فرخ فرِ آسماں | قرباں نہ کیوں زمیں کے ہو پھر پھیر کر آسماں
طالع سدا معین ہو عالم ترا مطیع | کوکب ہمیشہ یار ترا یاور آسماں
یوں آسماں سے رتبہ ترا یوں بلند تر | جس طرح کوہسار سے بالاتر آسماں
وہ بحرِ بیکراں ہے تری ہمتِ وسیع | ہے بلبلا سا ایک کنارے پر آسماں
دریائے قہر تیرا جو طوفاں کرے بپا | بہ جائے مثلِ کشتیٔ بے لنگر آسماں
قد پر ترے وہ راست قبائے علوِ جاہ | زیبندہ جس کے واسطے بالابر آسماں
تیری گہر فشانیٔ دستِ کرم سے ہے | گویا کہ ایک دامنِ پُر گوہر آسماں
یوں دل میں تیرے جلوۂ ذاتِ محیطِ حق | آجائے جیسے آئینہ کے اندر آسماں
یہ ذوقؔ کی دعا ہے کہ جب تک زمانے میں | منسوب ہیں ستارے سے ہے دورِ ہر آسماں
بزمِ نشاط و عیش ہے تیرے گھر میں روز | لائے ہمیشہ تیری مرادیں بر آسماں
سارے جگر ہیں حاسد و بدخواہ کے ترے | تارِ خطوطِ مہر سے شوریدہ تر آسماں (ذوق)

قصیدۂ مدحیہ

ہیں بھری آنکھ میں اشکوں کے تماشا گوہر | ایک گر دیکھو تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر
نظرِ خلق سے چھپ سکتے نہیں اہلِ صفا | تہِ دریا سے چمک کر نکل آیا گوہر
رزق تو در خورِ خواہش ہے پہنچتا سب کو | مرغ کو دانہ تو ہنس نے پایا گوہر
پاک دنیا سے ہیں دنیا میں ہیں گو پاک سرشت | غرق ہے آب میں پر تر نہیں اصلا گوہر
ہے دلِ صاف کو عزلت ہی میں گردوں سے بچاؤ | گرد آلودِ یتیمی ہوا تنہا گوہر
گوہرِ باطن سے ہو کیا جوہرِ دانش کی شناخت | کہ پرکھتا نہیں جز دیدۂ بینا گوہر
غیرِ پرمایہ نہ کم مایہ سے ہو ضبطِ ہوس | بہ گیا ژالہ ہوا الگ سے نہ پگھلا گوہر
ربط ناچیز سے کرتے ہیں کوئی پاک نہاد | ہو نہ ہم صحبتِ تارِ رگِ خارا گوہر

دلخراش اور ہے طاقت وہ دل ہے کچھ اور — کہ نہ گوہر کبھی ہیرا ہو نہ ہیرا گوہر
فیض کو عالمِ بالا کے ہے شرط استعداد — قطرہ اک جا ہے طبا شیر ہے اک جا گوہر
صدق اور کذب پہ ہر نکتہ کے ہے شرط نظر — کور کیا جانئے یہ سچا ہے کہ جھوٹا گوہر
صاف باطن کی ہو جب قدر کہ ظاہر ہو درست — یوں بھی ٹوٹ گیا صاف نہ جو ٹوٹا گوہر
ہوتی غربت میں اگر قدر نہ خوش جوہری — تو کبھی کان سے باہر نہ نکلتا گوہر
ذوق موقوف کر اندازِ غزل خوانی کو — ڈھونڈیے اس بحر میں آپ کوئی تو اچھا گوہر
غوطہ دریائے سخن میں ہے لگانا بہتر — آگے تقدیر سے خر مہرہ ملے یا گوہر
اثرِ مدح سے اس خسرو دریا دل کے — کر سخن متّا ہیچ گوشِ دلِ دانا گوہر
وہ بہادر شہِ غازی کہ برنگِ نیساں — روز برسائے ہے ابرِ کرم اسکا گوہر
جوش سے اُسکے ہے اِک فیض کا دریا جاری — بہتے پھرتے ہیں برنگِ کفِ دریا گوہر
زیور آرا ہوں اگر آج چمن میں گل و سرو — بیضۂ قمری و بلبل ہوں عجب کیا گوہر
پہونچے گر گوشِ صدف تک یہ نویدِ عشرت — اِتنا بالیدہ ہو بجرد ہو کہ مینا گوہر
موجِ گوہر میں بھی ہے طرزِ تبسم پیدا — کوئی دم میں روشِ غنچہ ہنسے گا گوہر
مدحِ حاضر میں کروں میں کوئی مطلع تحریر — آج ہے خامہ مرا منہ سے اُگلتا گوہر

مطلع

آج وہ دن ہے کہ اے خسروِ والا گوہر — کوہ دے تو زر تجھے لعل تو دریا گوہر
بحر و بر میں ہے شہا تیرے مہیا ہے نثار — سیم نے زر تنک تو دے لعل ہے بے تا گوہر
ہو ترے فیضِ قدم سے جو زمیں گوہر خیز — ہو نصیبِ صدفِ نقشِ کفِ پا گوہر
مشتری کہتے ہیں جسکو اُٹھا لایا چرخ — ٹوٹ کر جو تری شمسہ سے گرا تھا گوہر
صبحِ اقبال و سعادت کا ستارہ چمکا — جو ترے طرۂ دستار کا چمکا گوہر
پرورش دیوے چمن کو جو ترا ابرِ کرم — ہو ثمر میں بجز غنچہ ہو پیدا گوہر

ماہ نو جسکے لئے ہے نہ کہ گہنے کے لئے ‏— تیرے کنٹھے کا کہوں کیا آسے پایا گوہر

قدر افشانی ہے تیری اسقدر گھر ہیں ازاں ‏— بکتے ہیں فیض سے مفلس میں اٹھتا گوہر

تیرہ کا زہرہ کرے آب تری ہیبت عدل ‏— گر جو شن پائے کہیں سنگ سے ٹوٹا گوہر

آب دریائے کرم سے جو ترے سیراب ‏— ابر قطرہ سے برسنے لگیں کیا کیا گوہر

آج محفل میں تری وہ گہر افشانی ہے ‏— لگنے شمع میں ہیں آنسوؤں کی جا گوہر

تیرے دوران حفاظت میں کہاں گنج گزند ‏— حق میں بیمار کے بنتا ہے کب کا گوہر

ہمت سخا کا ترے ایک ہے نقشہ دریا ‏— دل روشن کا ترے ایک نمونہ گوہر

مہر ایزد جو کہوں سب ہے اوصاف کو ‏— تو سنہ اشہب سے مرے پھول جھڑیں یا گوہر

فوق [illegible] کرتا ہے دعا [illegible] جشن ‏— تا کہ ہو سنگ سے لعل آب سے پیدا گوہر

جب تلک ابر بہاراں سے ہوا وقت صبح ‏— تا نکلے شبنم سے سر دامن صحرا گوہر

ہر برس جشن ترا تجھکو مبارک ہووے ‏— ابر نیسان کرم سے ترے شاہا گوہر

دوستوں کو ہو ترے گنج گہر و نصیب ‏— ہو نہ جز اشک سر دامن اعدا گوہر

قصیدہ

سیاہ دل اشک کی آنکھوں نے کی ہے خونباری ‏— کہو کہ نیشتر مژگاں کرے علمداری

بجز عدم کا ہنر اندیشہ ہو گئی پامال ‏— وہ آنکھوں میں نہیں طالع میں تھی جو بیداری

نگاہ دل میں سمجھوں بصورت چشمان سیاہ ‏— کسی مریض پہ جس طرح رات ہو بھاری

زمانہ آپ کو شعلہ جبیں سمجھتا ہے ‏— کہ جانتا ہے سبب مجھ کا دل آزاری

نہیں جو داغ کسی دل میں بوستاں سمجھے ‏— کہے کہ نہر رواں ہے جو اشک ہیں جاری

عدم کو جاتے ہیں ہستی سے قافلے کیا کیا ‏— یہ شاہراہ شب و روز رہتی ہے جاری

ہر ایک سوار ہے پا در رکاب عالم میں ‏— سمند عمر میں کتنی ہے تیز رفتاری

جو دن کو مرتے ہیں ہر شام آنکے ماتم میں ‏— پہن کے آتی ہے شب جامہ عزاداری

اجل سے روح رہے تن سے کس طرح محفوظ
نہیں ہے قلعۂ آہن یہ چار دیواری

بجا ہے گرم کچہری جو ایسی موت کی ہے
کیا ہے منشی تقدیر نے قلم جاری

امید زوال جہاں سے عبث ہے الفت کی
یہ چیرہ جاتی ہے شمشیر عمر تیز اری

اٹھا ہے آپ ہی دم تیغ مرگ کا طوفان
جو ایک ڈوب گیا دوسرے کی ہے باری

ادھر تو تیر ادھر تیغ قضا یہ پڑتی ہے
کہاں کہاں کی بچا ہو سکے خبرداری

ادھر مکان بنا اس طرف مزار کھدا
ادھر لباس ادھر ہے کفن کی تیاری

سحر ہوئی ہے کھلا ہے سرا کا دروازہ
مسافروں سے کوچ کی ہے تیاری

وہ خوش خرام ہوئے خاک جن کے ماتم میں
زمیں پہ سر کو پٹکتی ہے کبک کہساری

وہ برق وش ہوئے انداز کھینچ کر معدوم
کہ جن کی خاک پہ روتا ہے ابر آذاری

لحد میں اُن پہ پڑا بوجھ سیکڑوں من کا
کسی کی جن سے نہ ہوتی تھی ناز برداری

زمیں نے ایک جہاں دام کر میں کھینچا
لحد نہیں یہ ہے زنبیل عمر عیاری

کہاں وہ تاج فریدوں کی تھی جو آرائش
کہاں وہ تخت سلیماں کی تھی جو تیاری

کہاں وہ عیش زلیخا کہاں وہ شاہی مصر
کہاں حضرت یوسف کی گرم بازاری

کسو کو آئی نہ اس کے فریب میں غافل
کہ باغ سبز دکھاتا ہے چرخ زنگاری

یہی حقیقت دنیا ہے تو ہے کیا دنیا
کسی سے کی نہ کرے گی کبھی وفاداری

ہوئی تھی جن کے لیے خلقت زمین و زماں
وہی جہاں سے گئے پیش حضرت باری

مسافر اس میں روانہ ہیں آنکھ بند کیے
عدم کی راہ میں دیکھو ہے کتنی ہمواری

غزلیات

غزل۔ لغت میں عورتوں سے باتیں کرنے کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں اُن مجموعہ اشعار کو کہتے ہیں جس میں حسن و عشق وصل و فراق اور عشق و محبت کے واردات کا بیان ہو لیکن اب شعرا نے ہر

...وسعت دے کر اخلاق و تصوف و مواعظ و جذبات قلبیہ کو بھی شامل کر لیا ہے۔ غزل میں مضامین مسلسل نہیں ہوتے ہر شعر کا مضمون جداگانہ ہوتا ہے۔ بعض شعرا نے مسلسل مضمون کی غزلیں بھی لکھی ہیں۔ غزل کے اشعار کم سے کم ۵ ہوتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ۱۷۔ مگر متاخرین نے ...سے زائد اشعار کی بھی غزلیں لکھی ہیں۔

میر محمد تقی میر

بے رنگیاں بے ثباتی یہ گلستاں بتایا — بلبل نے کیا سمجھ کر یاں آشیاں بنایا
اڑتی ہے خاک یارب شام و سحر جہاں میں — کس کے غبارِ دل سے یہ خاکداں بنایا
اک رنگ پر نہ رہنا یاں کا عجب نہیں ہے — کیا کیا نہ رنگ لائے تب یہ جہاں بنایا
آئینے میں کہاں ہے ایسی صفا کہے تو — جبہوں سے راستوں کے وہ آستاں بنایا
اس صحن پر یہ وسعت اللہ ری تیری صنعت — معمارِ قضا کے دل کیا مکاں بنایا
دریوزہ کرتے گزری گلیوں میں عمر اپنی — درویش کب ہوئے ہم تکیہ کہاں بنایا
وہ تو بنا گیا تھا تربت بھی میر جی کی — دو چار اینٹیں رکھ کر پھر یہ نشاں بنایا

۲

آرام ہو چکا مرے جسمِ نزار کو — رکھے خدا جہاں میں دلِ بے قرار کو
پانی پہ جیسے غنچۂ لالہ پھرے بہتا — دیکھا میں آنسوؤں میں دلِ داغدار کو
برسا تو میرے دیدۂ خونبار کے حضور — پر آب تک انفعال ہے ابرِ بہار کو
ہنستا ہی میں پھروں جو مرا کچھ ہو اختیار — پر کیا کروں میں دیدۂ بے اختیار کو
عشق کی سوائے نہ دیکھا جہاں میں کچھ — یک عمرِ خضر سیر کیا اس دیار کو
کس کس کی خاک رنگی ملاتی ہے خاک میں — جاتی ہے پھر نسیم اسی رہگذار کو
لاوے وہ کوئی جو آج پیوے شرابِ عیش — خاطر میں رکھیو کل کے بھی رنجِ خمار کو
جیتے جی فکر خوب ہے ورنہ یہ بلا — رکھے گا حشر تک تہ و بالا مزار کو

۳

اس باغ بے ثبات میں کیا دل صبا لگے
کیا کیا نہال دیکھتے یاں پانوں آ لگے

حرص و ہوس سے باز ہے دل تو خوب ہے
ہے قہر اس کلی کے تئیں گر ہوا لگے

تلخ اب تو اپنے جی کو بھی لگتی ہے اس نمط
جیسے کسو کے زخم پہ تیزاب دوا لگے

کسکو خبر ہو کشتی تباہوں کے حال کی
تختہ مگر کنارے کوئی بہ کے جا لگے

مقصود کے خیال میں بہتوں نے چھانی خاک
عالم تمام وہم ہے یاں ہاتھ کیا لگے

سب چاہتے ہیں دیدہ ہے میر دل زدہ
یارب کسو تو دوست کی اسکو دعا لگے

۴

دل جو زیر غبار اکثر تھا
کچھ مزاج ان دنوں مکدر تھا

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم
یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا

اب خراب ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میر معلوم ہے قلندر تھا

خواجہ میر درد

کھلا دروازہ میرے دل پہ از بس اور عالم کا
نہ اندیشہ ہے شادی کا مجھے نے فکر ہے غم کا

بلند و پست سب ہموار ہیں اپنی نگاہوں میں
برابر ساز میں ہوتا ہے جوں شور زیر و بم کا

گلستان جہاں کی دید کیجے چشم عبرت سے
کہ ہر اک سرو قد ہے اس چمن میں نخل ماتم کا

چمن میں باغباں سے صبح کو کہتی تھی یہ بلبل
گلوں کے منہ پہ یوں پڑتی ہے کے یہ دیدہ شبنم کا

نہیں مذکور شاہاں درد ہرگز اپنی مجلس میں
کبھو کچھ ذکر آیا بھی تو ابراہیم ادہم کا

۲

نہ ہاتھ اٹھائے فلک گو ہمارے جینے سے
کسے دماغ کہ ہو دو بدو کمینے سے

نہیں خیال مجھے خاتم سلیماں کا — بس نگیں نام ہو ہو کندہ دل نگینے سے
بیان ہو وے انگوٹھے پہ ستوں سے — لیا ہے فیض بہت دل کے آبگینے سے
ترقی اور تنزل کو یاں کے کچھ عرصہ — مثال اس کی زیادہ نہیں ہے زینے سے
سنگ ہے ہے دل زندہ تو تمہارا ہو — کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے
آل کار ستم جھا یا قبور سے نکو — یہ مقدار لگا ہاتھ اس نگینے سے
سبا ہے کون ترے دل میں گلبدن اُٹھ رہ — کہ [illegible] کی آئی ترے پسینے سے

۳

ذوق کیا ہے ہوس ایک ذوق ہم ہی باغ ہے — آپ کہیں نہ جائیے پتا نہیں سراغ ہے
دیکھئے جھکو یاں آئے آو ہی کچھ فراغ ہے — ایک شب چراغ تھی [illegible] شب چراغ ہے
غیر سے کیا معاملہ آپ ہیں اپنے دام میں — قید خودی ہوا اگر پھر تو ہے فراغ ہے
حال دل اپنا پوچھئے جو کہوں میں سو کیا کہوں — دل ہے نشیب [illegible] ہے سینہ داغ داغ ہے
[illegible] کی آبرو — دیدہ آئینہ کی طرح تجھ سے بھرا ایاغ ہے
[illegible] دل کہ آہ ہم سے ہے چھپا کہیں — اپنی تلاش سے غرض ہم کو ترا سراغ ہے
غفلت دل سے [illegible] خلق درد — بلبل داستاں ترا [illegible] داغ ہے

مرزا محمد رفیع سودا

آرام پھر کہاں ہے جو ہو دل میں جائے حرص — آسودہ [illegible] نہیں آشنائے حرص
ممکن نہیں ہے یہ کہ بھرے کاسۂ طمع — دل میں کرو [illegible] جو پھر اوسے گدائے حرص
انساں ہو ذلیل زمانے کے ہاتھ سے — ذلت کوئی کسی کو نہ دیوے سوائے حرص
[illegible] کو ملک ہووے قناعت [illegible] — رہتی ہے لاکھ [illegible] کی آفت بجائے حرص
[illegible] تلاش [illegible] — جوں شمع یوں [illegible] سر پا سے حرص

اپنے سوا کسی کو نہ پایا حریص حیف
کی قطع روزگار نے ہم پر قبائے حرص

سودا بسر ہو خوبی سے اوقات ہر طرح
پر درمیاں نہ ہووے بشرطیکہ پائے حرص

۲

طبیعت سے فرومایہ کی شعر تر نہیں ہوتا
جو آب چاہ کا قطرہ ہے وہ گوہر نہیں ہوتا

ہنر سے دور ہے بد اصل کی خلقت کا آئینہ
خمیر سنگ سے بنتا ہے تو جوہر نہیں ہوتا

نہ جانے عکس دیکھیں پڑا کس اہل خست کا
کہ آب آئینہ سے لب کسو کا تر نہیں ہوتا

سعادت ہو کریمی کہ بعد از مرگ عالم میں
ہما کے بال کا مصرف بجز افسر نہیں ہوتا

طمع دولت کی بیتابی تعب عشار کہتا ہے
فسوں آتا نہ جھونکے آگ میں مس زر نہیں ہوتا

نہ پوچھ خضر پیر رہنما منزل مقصد کو اے سودا
کوئی خود رفتگی سے راہبر بہتر نہیں ہوتا

۳

ہے تنگ زمانے میں بہت عمر کا توسن
اس میں عمل نیک کیا چاہے تو کر لے

دکھ دے نہ کسو دل کے تئیں باغ جہاں میں
گر نخل حیات اپنے سے چاہے کہ ثمر لے

نے خضر ہوس عمر ابد کی نہیں مجھکو
اس دم کی تمنا ہے جو کچھ پاس گذر لے

پوچھا جو میں سودا سے کہ ہاتھ اسکے لگے گا
اتنا میں کہا بھر کے دم سرد اگر لے

مومن خان مومن

تم بھی رہنے لگے خفا صاحب
کہیں سایہ مرا پڑا صاحب

کیوں الجھتے ہو جنبش لب سے
خیر ہے میں نے کیا کہا صاحب

کیوں لگے دینے خط آزادی
کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب

ستم آزار ظلم و جور و جفا
جو کیا سو بھلا کیا صاحب

نام عشق بتاں نہ لو مومن
کیجئے بس خدا خدا صاحب

انشاء اللہ خاں انشا

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں — بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں — نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے افتادگی سے ان دنوں پہروں — نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہیں ہیں صبر کسکو آہ ننگ و نام کیا شے ہے — غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم اک بار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو — جسے پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں
کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے سنا انشا — غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

۲

جس شخص نے کہ اپنے نخوت کے بل کو توڑا — راہِ خدا میں اس نے گویا جبل کو توڑا
اپنا دلِ شگفتہ تالاب کا کنول تھا — افسوس تو نے ظالم ایسے کنول کو توڑا
تھا ساعتِ زندگی دل چپ جو ہو رہا ہے — کیا جانئے کہ کس نے ہے اس کی کل کو توڑا
دارا و جم نے کیا کیا تجھ سے شکست پائی — اے چرخ تو نے کس کس اہلِ دول کو توڑا
یعنی ہے عیشِ دل تو ظالم تو آج لے چپک — پڑ جائے گا وگرنہ پھر کس کا کل کو توڑا
احوال خوش انھوں کا انشا میاں جنھوں نے — اس ذاتِ بحت سے مل ہستیِ امل کو توڑا

۳

حق تعالیٰ کی طرف سے جسے امداد نہ ہو — تو وہ گھر تا بہ قیامت کبھی آباد نہ ہو
ہے یہ انصاف بھلا خوش رہے بس تو ہی فقط — چھٹ ترے اک متنفس کبھی دلشاد نہ ہو
خانہ آباد ۔ جو اجڑے ہوئے ہوں انکو شتاب — نہ کہ یہ قصد کہ کوئی کہیں آباد نہ ہو
مٹ گیا جب کہ حباب آہ تب آئی یہ صدا — زندگانی ہی نہیں جسکی یہ بنیاد نہ ہو
بے ستوں پر جو کھلا لالہ تو شیریں نے کہا — مجھے ڈر ہے کہ یہ خونِ سرِ فرہاد نہ ہو

شور اپنا نہ کرے مرغِ نوا سنج خموش — یاں کوئی دام لگائے کہیں صیاد نہ ہو
تو بھلا سوچ تو کچھ گوشۂ دل میں کیونکر — تیرے شکیب کی جگہ اے ستم ایجاد نہ ہو
ہو جو انشاؔ کو اجازت تو پھرے وہ نالہ — کبھی بلبل کے فرشتوں کو بھی جو یاد نہ ہو

۴

بس نہ دنیا کی ہو کیجے صاحبِ ادراک ہوس — خاک ہی خاک ہے سب خاک کی کیا خاک ہوس
تھوڑی سی عمر میں کس شے کی ہوس کیجے کہ بس — کرنے دیتی ہی نہیں گردشِ افلاک ہوس
طرح مجنوں سے کوئی پوچھے کہ کیا رکھتی ہے — دشت پیمائے بیابانِ خطرناک ہوس
بھر گئے دامنِ نظارہ میں نرگس کے پھول — اور کیا رکھتے ہے اب دیدۂ نمناک ہوس
میں نکالوں ہوں تصدق ہو بگولے کی طرح — کوچۂ یار میں با ہر خس و خاشاک ہوس
جب تلک شیشۂ صہبا نہ کھولے زاہدِ خشک — یاں بجھاوے ہے کوئی کاسۂ تریاک ہوس
چل مدینے کی زیارت کو تو انشاء اللہ — کہ نکالیں گے تری واں شہِ لولاک ہوس

۵

چھیڑنے کا تو مزہ جب ہے کہو اور سنو — بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو
تم کہو گے جسے کچھ کیوں نہ کہے گا تم کو — چھوڑ دے گا وہ بھلا دیکھیے تو اور سنو
یہ بھی انصاف ہے کچھ سوچو تو اپنے دل میں — تم تو سو کہہ لو مری کچھ نہ سنو اور سنو
اب تو کچھ اتنے خفا ہو کہ کہو ہو مجھ سے — ہے قسم تم کو مرا نام نہ لو اور سنو
بات میری جو نہیں سنتے اکیلے مل کے — ایسی ہی ڈھب سے سناؤں کہ سنو اور سنو
شکوہ منہ آپ سے انشاؔ ہو سو اس کا کیا دخل — تم نہ مانو تو کہیں چپکے چھپو اور سنو

شیخ امام بخش ناسخ

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا — طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

ازل سے تھی ہی طاؤس آپس میں لگتے ہیں — داغ پر داغ لوگ کیا [illegible] اپنے پیاں کا
شگفتہ تھی گل ہر فصل گل میں داغ ہوتے ہیں — بیاں سے کیا ہمارا لب ناک گلستاں کا
سیہ خانہ ہمارا روشن ہوا ویراں ہو نے سے — کیا دیوار کے [illegible] نے یاں عالم پریشاں کا
[illegible] کی جیب سفیدی دیکھتا ہوں [illegible] — تو عالم یاد آتا ہے [illegible] ہجراں کا
ہر اک [illegible] آتش معمور حیرت سے — یقیں ہے [illegible] دیوانہ [illegible] کا
جنوں میں ہجر کی شب ہاتھ [illegible] — کیا ہے چاک تا جیب اپنے گریباں کا
[illegible] [illegible] ناسخ — کہ عالم ہو [illegible] زخم پہ تھا [illegible] کا

۲

[illegible] جیسے دولا [illegible] حرص — [illegible] آتی ہم [illegible] تھا حرص
دنیا میں دریا سمجھے کب تک [illegible] حرص — [illegible] قناعت [illegible] کہیں [illegible] حرص
دنیا کی ساری خاک اگر ہو [illegible] حرص — ایسی [illegible] نہیں [illegible] حرص
تو ڑ دل جو اپنے پاس طلب [illegible] نہیں — [illegible] [illegible] حرص
ہے کشتی نجات قناعت بھی [illegible] — [illegible] [illegible] حرص

۳

ماہ تو سے جو وہ خورشید مقابل ہو گا — یہ یقیں ہے کہ نظر آتے ہی کامل ہو گا
اس پہ آفت نہیں [illegible] ہو گا — [illegible] [illegible] بسمل ہو گا
ہر دم چشم ملائک ہیں ترے خال سیاہ — [illegible] خورشید پہ ایسا کوئی تل ہو گا
شمس جا میں گے منجم تجھے اور آنکھ تو — آئینہ جیسا ترے چہرے سے مقابل ہو گا
غافل [illegible] غفلت سے نہ [illegible] مجھکو — دیکھنا [illegible] سر کا [illegible] ہو گا
آسماں کو نہ ہیبت [illegible] دیکھ [illegible] ظالم — ابھی [illegible] ہر ایک عرش کا حاصل ہو گا
[illegible] ہے مجکو عیش لالہ رخوں سے ناسخ — داغ حسرت کے سوا خاک نہ حاصل ہو گا

میر حیدر علی آتش

باغِ عالم میں نہیں کون ثنا خوان تیرا
ذکر کرتا ہے ہر اک مرغِ خوش الحاں تیرا

کوئی تجھ سا نہیں - لاثانی ہے تو اے محبوب
حق تو یہ ہے کہ جو عاشق ہو تو انساں تیرا

تو ہے مطلوب اُسے ادنیٰ ہو کہ اعلیٰ کوئی
دم بھرا کرتا ہے مور اور سلیماں تیرا

لالہ ہی اک نہیں اسنے پایا داغِ غلامی
سروِ آزاد بھی ہے بندۂ احساں تیرا

بات ہے مصلحتِ وقت نہیں کی تونے
عین حکمت ہے وہ جو کچھ کہ ہے فرماں تیرا

کون عالم میں ہے ایسا جو نہیں سر بسجود
کس کی گردن کو جھکاتا نہیں احساں تیرا

باغِ عالم میں ترے دم سے ہے اپنی ہستی
جیتے ہیں سونگھ کے ہم سیبِ زنخداں تیرا

جسمِ خاکی سے ہے دشوار رسائی تجھ تک
گرد اُڑ کر نہیں چھو سکتی ہے داماں تیرا

بانٹ چاہے جسے دولت دو جہاں کی تو دے
چاہتا تیرے سوا کچھ نہیں خواہاں تیرا

عشق نے آنکھوں کو دیدار دکھایا آخر
پردہ پوشی سے ہوا حسن نہ پنہاں تیرا

نیتِ اہلِ توکل ہے کرم نے بھر دی
سیر نعمت سے دو عالم کی ہے مہماں تیرا

کس پری رخ کا دیوانہ ہے تو اے آتش
چاک رہتا ہے جو ہر بار گریباں تیرا

۳

ہوا ہے عشق ہمکو اسکے حسنِ پاک سے پیدا
کیا ہے نور کے پتلوں کو جس نے خاک سے پیدا

کلامِ صاف کو اپنے جو دیکھے اسکو حیرت ہو
یہ آئینہ ہوا ہے جوہرِ ادراک سے پیدا

ہمارے خلق میں دن رات ذکرِ ذاتِ اقدس ہے
قضا نے کی ہے یہ تسبیح خاکِ پاک سے پیدا

غنیمت ہی سمجھئے حلقۂ احباب گرد اپنے
یہ دورہ پھر نہ ہوگا گردشِ افلاک سے پیدا

دماغِ حضرتِ یعقوب عاشق اسکو کہتے ہیں
ہوئی ہے بوئے یوسف یار کی پوشاک سے پیدا

دلِ صد پارہ کے ہر پارہ پر نقشِ محبت ہے
کہاں ہو سکتے ہیں ایسے نگیں حکاک سے پیدا

مسیحا سے ہمارے عیسیِٰ مریم کو کیا نسبت
شفا ہوتی ہے کسکی آستاں کی خاک سے پیدا

ہنر سے نیامیوں کے حال یہ ظاہر ہوا ہمکو   مقید ہیں جو دولت ہو تو زر ہو خاک سے پیدا
کنارہ بحر ہستی سے نہیں بے جان سے گذرے   کنارہ گور ہے اسکا جو ہو پیراک سے پیدا
دعائے آتش خستہ یہی ہے روز محشر کو   یہ تشت خاک ہو وے کربلا کی خاک سے پیدا

۳

سر شمع ساں کٹائیے پر دم نہ ماریے   منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریے
مقسوم کا جو ہے سو وہ پہونچے گا آپ سے   پھیلائیے نہ ہاتھ نہ دامن پساریے
طالب کو اپنے رکھتی ہے دنیا ذلیل و خوار   زر کی طمع سے چھانتے ہیں خاک نیاریے
تنہائی ہے غریبی ہے صحرا ہے خار ہے   کون آشنا ہے حال ہے کس کو پکاریے
تم فاتحہ بھی پڑھ چکے ہم دفن بھی ہوئے   بس خاک میں ملا چکے چلیئے سدھاریے
نازک دلوں کو شرط ہے آتش خیال یار   شیشہ پیدا جو دے تو پری کو اتاریے

۳

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا   بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
عجب کیا چھٹا روح سے جامۂ تن   لٹے راہ میں کارواں کیسے کیسے
نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا   مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
بہار گلستاں کی ہے آمد آمد   خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے
توجہ نے تیری ہمارے مسیحا   توانا کیے ناتواں کیسے کیسے
دل و دیدۂ اہل عالم میں گھر ہے   تمہارے لئے ہیں مکاں کیسے کیسے
غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں   ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے
کرے جس قدر شکر نعمت وہ کم ہے   مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

شیخ محمد ابراہیم ذوق

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا   جو آپ ہی مر رہا ہو اسکو گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا | نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا
نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا | اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا
ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا | کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں | اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا
دلِ بد خواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بد بیں میں | فلک پر ذوق تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

۲

پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے | کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے
جب بنی تیرِ حوادث کی بلا افلاک سے | خاک کا تودہ بنا انساں کی مشتِ خاک سے
جس طرح دیکھے قفس سے باغ کو مرغِ اسیر | جھانکتا ہے دل تجھے یوں سینۂ صد چاک سے
تیرے صیدِ نیم جاں کی جان نکلے کس طرح | یہ تو وابستہ ہے تیرے دامنِ فتراک سے
آفتابِ حشر ہے یا رب کہ نکلا گرم گرم | اشکِ خونیں دل جلوں کے دیدۂ نمناک سے
چشم کو بے پردہ ہو کس طرح نظّارہ نصیب | کرتا وہ پردہ نشیں پر وہ تو ہے ادراک سے
عیبِ ذاتی کو چھپا سکتا ہے حسنِ عارضی | زیب یہ اندام کو ہے ذوق کیا پوشاک سے

۳

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے | ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے
رہے جوں شیشۂ ساعت وہ مگر دونوں | کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے
حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ وسعت | تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے
کیا تماشا ہے کہ مثلِ مہِ نو دے کے فروغ | خود نمائی کو ہیں چمکا رہے شہرت والے
کبھی افسوس ہے آتا کبھی رونا آتا | دلِ بیمار کے ہیں دو ہی عیادت والے
ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق | اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

۴

نہیں ہے نورِ قمر کے گرنے سے صاف اظہارِ روشنی ہے — کہ ہے جو روشن یہ ماہ اتنا فروغ اُن کی ہی روشنی ہے
بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اسکی فروتنی ہے — وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے
ہوئے ہیں [illegible] راست سے اسقدر [illegible] — کہ میری [illegible] کے آگے عرقِ عرق پاک [illegible] ہے
ہوئے ہیں [illegible] اپنی سادگی سے ہم آشنا [illegible] — اگر [illegible] تو پھر کسی سے نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے
لگانا اس [illegible] میں دل سے [illegible] شیشۂ شکستہ [illegible] — کہ کیسا ہی کوئی خوش شمائل صنم ہے آخر کو [illegible] ہے
نہیں ہے قانع کو خواہشِ زر [illegible] — جہاں میں مانند کیمیا گر ہمیشہ محتاج دل غنی ہے
ظفر وہ ہے کافر کوئی مسلماں [illegible] — جو اسکے نزدیک بہتری ہے وہ اسکے نزدیک بہتری ہے

بہادر شاہ ظفر

مقدور کس کو حمدِ خدائے جلیل کا — اس جا ہے بے زباں دہنِ قال و قیل کا
پانی میں اس نے راہبری کی کلیم کی — آتش میں وہ ہوا چمن آرا خلیل کا
اس کی مدد سے فوجِ ابابیل نے کیا — لشکر تباہ کعبہ پہ اصحابِ فیل کا
پیدا کیا وہ اس نے بشر عین عشق — پُل جس کی ساقِ پا سے بنا [illegible] کا
پھرتا ہے اسکے حکم سے گردوں یہ رات دن — چلتا ہے یاں عمل کوئی [illegible] کا
کیا پائے کنہِ ذات کو اس کے کوئی ظفر — واں عقل کا نہ دخل نہ ہرگز دلیل کا

۳

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا — یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے — کیوں خرد مند بنایا نہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لئے گرچہ بنایا تھا مجھے — کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا
کشتۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھکو — عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دلِ صد چاک بنایا تو بلا سے لیکن — زلفِ مشکیں کا ترے شانہ بنایا ہوتا
صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے — قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا

تھا جلانا ہی اگر دوریِ ساقی سے مجھے — تو چراغِ درِ میخانہ بنایا ہوتا
شعلۂ حسن چمن میں نہ دکھایا اُس نے — ورنہ بلبل کو بھی پروانہ بنایا ہوتا
روزِ معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر — ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

اتنا نہ اپنے جامے سے باہر نکل کے چل — دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل
کم ظرف پُر غرور ذرا اپنا ظرف دیکھ — مانندِ جوشِ غم نہ زیادہ اُبل کے چل
فرصت ہے اک صدا کی یہاں سوزِ دل کے ساتھ — اس پر سپند وار نہ اتنا اچھل کے چل
یہ غول وش ہیں ان کو سمجھ تو نہ رہنما — سائے سے بچ کے اہلِ فریب و دغل کے چل
اوروں کے بل پہ بل نہ کر اتنا نہ چل نکل — بل ہے تو بل کے بل پہ تو کچھ اپنے بل کے چل
انساں کو کل کا پتلا بنایا ہے اُس نے آپ — اور آپ ہی وہ کہتا ہے پتلے کو کل کے چل
پھر آنکھیں بھی تو دیں ہیں کہ رکھ دیکھکر قدم — کہتا ہے کون تجھکو نہ چل چل سنبھل کے چل
ہو امتحانِ طبع کرے اپنا اے ظفر — تو کہہ دو اُس سے طور پہ تو اس غزل کے چل

وہاں کی مخلصی لے لے قسمت ہو تو کیونکر ہو — کہ میں آلودۂ عصیاں میں جو رحمت ہو تو کیونکر ہو
بجز رونے کے ہاں چشمِ عنایت ہو تو کیونکر ہو — کہ بے اشکِ ندامت جوشِ رحمت ہو تو کیونکر ہو
جہاں ہو نفس سا رہزن جہاں شیطان ہو دشمن — وہاں طاعت ہو کیونکر اور عبادت ہو تو کیونکر ہو
غرورِ جاہ نے پھونکی وہ مغزِ جاں میں ہے سیخی — کہ زائل نشۂ پندار و نخوت ہو تو کیونکر ہو
گراں باری گناہوں کی اُٹھانے سر نہیں دیتی — الٰہی کیا کروں پھر رفعِ خجلت ہو تو کیونکر ہو
نتیجہ جب کہ ہو اعمالِ بد کا حالِ بد اپنا — تو پھر ناحق کسی کی کچھ شکایت ہو تو کیونکر ہو
ہوس کہتی ہے چل یاں سے کہے ہے حرص لا دانے — توکل ہو تو کیونکر ہو قناعت ہو تو کیونکر ہو
بہ رنگِ طائرِ تصویر ہوں میں دامِ حیرت میں — رہائی کی مری کوئی جو صورت ہو تو کیونکر ہو

وہ ہمت ہی سے ہو سکتا ہے جو ہے کام ہمت کا   ظفر بے ہمتوں سے صرف ہمت ہو تو کیونکر ہو

منشی امیر احمد امیرؔ مینائی

بندہ نوازیوں پہ خدائے کریم تھا   کرتا نہ میں گنہ تو گناہِ عظیم تھا
باتیں بھی کیں خدا نے دکھایا جمال بھی   اللہ کیا نصیب جنابِ کلیم تھا
دنیا میں کچھ قیام نہ سمجھو کرو خیال   اس گھر میں تم سے پہلے بھی کوئی مقیم تھا
دنیا کا حال اہلِ عدم سے یہ مختصر   اک دو قدم کا کوچۂ امید و بیم تھا
ہم اپنی دھن میں مست تھے کیا جانیں حشر میں   کس سمت کو جناں تھا کدھر کو جحیم تھا
سامانِ عفو کیا میں کہوں مختصر یہ ہے   بندہ گنہگار تھا خالق کریم تھا
کرتا میں دردمند طبیبوں سے کیا رجوع   جس نے دیا تھا درد بڑا وہ حکیم تھا
جس دن تھا میں چمن میں ہوا خواہِ گل امیرؔ   نامِ صبا کہیں نہ نشانِ نسیم تھا

۲

ریاضِ دہر میں تو پوچھو نہ میری بربادی   برنگِ بو ادھر آیا ادھر روانہ ہوا
خدا کی راہ میں دینا ہے گھر کا بھر لینا   ادھر دیا کہ ادھر داخلِ خزانہ ہوا
ہوا فروغ جو مجھ کو غمِ زمانہ ہوا   پڑا جو داغ جگر میں چراغ خانہ ہوا
تب آئی جوش میں میرے کریم کی رحمت   گرا جو آنکھ سے موتی تو درِ یگانہ ہوا
چنے مہینوں ہی تنکے غریب بلبل نے   مگر نصیب نہ دو روز آشیانہ ہوا
اٹھائے صدمے پہ صدمے تو آبرو پائی   امیرؔ ٹوٹ کے دل گوہرِ یگانہ ہوا

۳

ہے باغ باغ بلبل جس طرح تو چمن میں   پھرتے تھے یوں ہی ہم بھی خوش خوش کبھی وطن میں
آزاد رہ کے ہم نے ایّامِ عمر کاٹے   دو چار دن سفر میں دو چار دن وطن میں

ظاہر پہ جا نہ اسکے ہے پیرزالِ دنیا — غافل ہے یہ زلیخا یوسف کے پیرہن میں
حالِ بدن کہوں کیا دل ہی بجھا ہوا ہے — اک شمع ہے سو وہ بھی خاموش انجمن میں
یاروں سے انس کیسا غربت میں عمر گذری — ٹھہرے مسافرانہ دو چار دن وطن میں
راتوں کو مثلِ شبنم چھپ چھپ کے باغباں سے — ہر پھول سے لپٹ کر روتا ہوں میں چمن میں
غربت میں ہے جو صورت خط میں لکھوں کہاں تک — تصویر اپنی بھیجوں احباب کو وطن میں
موئے سفید سر پر تیاری عدم ہے — غربت سے خاک اڑاتے جاتے ہیں ہم وطن میں
وحشت امیر اپنی کچھ آج سے نہیں ہے — مانندِ گل ازل سے ہے چاک پیرہن میں

۴

دیر میں کون ہے کعبے میں گذر کس کا ہے — یار کا گھر یہ اگر ہے تو وہ گھر کس کا ہے
تندرستوں نے قضا کی ہوئے بیمار صحیح — پہلے کیا جانیے دنیا سے سفر کس کا ہے
دانے کی خاک نشینی سے ہوئی نشو و نما — خاکساری کا نہیں تو یہ ثمر کس کا ہے
کوئی آتا ہے عدم سے تو کوئی جاتا ہے — سخت دونوں میں خدا جانے سفر کس کا ہے
چھپ رہا ہے قفسِ تن میں جو ہر طائرِ دل — آنکھ کھولے ہوئے شاہینِ نظر کس کا ہے
کھول کر منہ کو مرے گور میں مانندِ عروس — بولی عبرت کہ ذرا دیکھ یہ گھر کس کا ہے
نام شاعر نہ سہی شعر کا مضموں ہو خوب — پھل سے مطلب ہمیں کیا کام شجر کس کا ہے
شوق ہوتا ہے عمارت کا تو مجھ سے عبرت — کہتی ہے گور جھنکا کے کہ یہ گھر کس کا ہے
میری حیرت کا یہ باعث ہے شبِ وصل امیر — سر پہ زانو ہوں کہ زانو پہ یہ سر کس کا ہے

نواب مرزا خاں داغ

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے — دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
ہم نکمے ہوئے زمانے سے — کام ایسا سکھا دیا تو نے

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے — دلِ بے مدعا دیا تو نے
کیا بتاؤں کہ کیا لیا میں نے — کیا کہوں میں کہ کیا دیا تو نے
بے طلب جو ملا ملا مجھ کو — بے غرض جو دیا دیا تو نے
نارِ نمرود کو کیا گلزار — دوست کو یوں بچا دیا تو نے
صبح موجِ نسیم گلشن کو — نفسِ جاں فزا دیا تو نے
شبِ تیرہ میں شمعِ روشن کو — نورِ خورشید کا دیا تو نے
نغمہ بلبل کو رنگ و بو گل کو — دلکش و خوشنما دیا تو نے
کبھی مشتاق سے حجاب ہوا — کبھی پردہ اٹھا دیا تو نے
جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی — اس سے مجھ کو سوا دیا تو نے
رہبرِ خضر و ہادیِ الیاس — مجھ کو وہ رہنما دیا تو نے
مٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب — نقشہ ایسا جما دیا تو نے
ہے یہی راہِ منزلِ مقصود — خوب رستے لگا دیا تو نے
مجھ گنہگار کو جو بخشش دیا — تو جہنم کو کیا دیا تو نے
داغ کو کون دینے والا تھا — جو دیا اے خدا دیا تو نے

۲

یا رب ہے بخش دینا بندے کو کام تیرا — محروم رہ نہ جائے کل یہ غلام تیرا
جب تک ہے دل بغل میں ہر دم ہے یاد تیری — جب تک زباں ہے منہ میں جاری ہو نام تیرا
ہے تو ہی دینے والا پستی سے دے بلندی — اسفل مقام میرا اعلیٰ مقام تیرا
محروم کیوں رہوں میں جی بھر کے کیوں نہ لوں میں — دیتا ہے رزق سب کو ہے فیضِ عام تیرا
یہ داغ بھی نہ ہوگا تیرے سوا کسی کا — کونین میں ہے جو کچھ وہ ہے تمام تیرا

۳

ثبات بحرِ فنا میں اپنا فقط مثالِ حباب دیکھا — نہ جوش دیکھا نہ شور دیکھا نہ موج دیکھی نہ خواب دیکھا
ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب عجب انتخاب دیکھا — برائی دیکھی بھلائی دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا
سرورِ عیش و نشاط جیسے بدل گئے رنگ ہی جہاں کے — شباب کا نور سے تھا جو ہنسنے وہ آنکھوں سے انقلاب دیکھا

٤

آپ دل ہے مقام بیکسی کا — یوں گھر نہ تباہ ہو کسی کا
جو دم ہے وہ ہے لبا غنیمت — سارا سودا ہے اپنے جی کا
آغاز کو کون پوچھتا ہے — انجام اچھا ہو آدمی کا
کہتے ہیں اُسے زبانِ اُردو — جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

٥

ہم دشمن بھی کیا ہوں تو الفت ہو ہی جاتی ہے — یہ شغل شیدا ایا محبت ہو ہی جاتی ہے
مصیبت گر کسی پر ہو محبت ہی کا خو گر ہو — لگا رکھا ہی شغل تو قناعت ہو ہی جاتی ہے
خدا رکھے تو داغ کو نالاں تجھ تو وہ کبھی ہے اُس — کر ان باتوں سے اے نادان محبت ہو ہی جاتی ہے

٦

افسردہ دل کبھی خلوت نہ انجمن میں رہے — بہار ہو کے رہے ہم تو جس چمن میں رہے
ملے جو بے وطنی میں ذرا بھی آسائش — عقیق جا کے عدن میں گہر یمن میں رہے
مسافرت میں جب آرام پا چکے اسے داغ — کہ تم سفر میں رہو آسمان وطن میں رہے

٧

غم اٹھانے کے جو سلیقہ ہے — زندگی ہے اگر تو کیا غم ہے
کہتے ہو کچھ کہو کہیں کیا تک — جانتا ہوں مزاج برہم ہے
اک جہاں مہرباں ہوا لیکن — مہربانی تیری مسلّم ہے

٨

گلشن میں ہرے ہو کے شجر لائے ثمر بھی — اے بارشِ رحمت کوئی چھینٹا تو اِدھر بھی
اک چیز ہے اِس عالمِ ہستی میں بشر بھی — دنیا کا طلبگار بھی دیتا ہے خبر بھی
ہوتی ہے دعا کافر و دیندار کی مقبول — اللہ کی سرکار میں ملتا ہے اثر بھی

منشی امیر اللہ تسلیم

نہ ہوگا حشر میں کوئی کسی کا — بھروسا ہے تو اپنی بیکسی کا
رُلاتا ہے مجھے کیوں اِس قدر بخت — لیا تھا نام میں نے کب ہنسی کا
سدا گریاں رہا مانندِ شبنم — نہ دیکھا منہ مرے غم نے خوشی کا
نہ کچھ دنیا میں رکھتا ہوں نہ دیں میں — بھلا ہو دو جہاں میں مفلسی کا
خیال آیا تری رحمت کا جس دم — جگر پانی ہوا تردامنی کا
تنِ خاکی کو بھی چھوڑا لحد میں — خیال آیا جو عہدِ بیکسی کا
مرا جو نالہ موزوں ہے تسلیم — تصدق ہے نسیمِ دہلوی کا

۲

کرو نہ دیر جہاں میں جہاں سے آئے چلو — یہاں گمانِ خطر ہے قدم بڑھائے چلو
یہاں فریبِ نشیب و فراز اکثر ہے — خدا کے واسطے اِتنا نہ منہ اٹھائے چلو
شکستہ پا ہوں کہیں ساتھ سے نہ رہ جاؤں — مجھے بھی ہاتھ ذرا دوستوں لگائے چلو
ہمیشہ ملکِ عدم کے بنے رہو سفری — اُدھر سے لینے کو پیکِ قضا جب آئے چلو
ابھی تو حسنِ عمل کا زمانہ باقی ہے — وہاں کی بگڑی ہوئی کچھ یہیں بنائے چلو
اِدھر اُدھر کہیں پھر کر ترارہ جا نہ پڑے — سمندِ عمرِ رواں کو ذرا دبائے چلو
عدم میں ترسو گے دردِ جگر کو اے تسلیم — جو ہو سکے کوئی سینے پہ تیر کھائے چلو

قریب کام پڑے وقت پر نہیں آتا
بجھانے دل کی لگی کو جگر نہیں آتا
کہاں گئے جو عیادت پہ جان دیتے تھے
مزار میں کوئی لینے خبر نہیں آتا
حجاب دیدۂ نرگس سے باغ میں نہ کرو
یہ دیکھنے کی ہیں آنکھیں نظر نہیں آتا
لحد کو نشۂ دولت میں بھولے ہیں منعم
خبر نہیں کہ وہاں کام زر نہیں آتا
جہاں میں صورت تصویر ہوں سراپا خوب
مگر یہ عیب ہے کوئی ہنر نہیں آتا
وہ شمع ہوں کہ جلاتے ہیں دوست دشمن سب
کسی کو رحم مرے حال پر نہیں آتا
خیال گو یہ بھی تنک ہے ابر طوفاں کو
کہ اشک دیدۂ تر جوش پر نہیں آتا
خیال خام ہے اپنے سے منتفع ہونا
صدف کے کام کسی دن گہر نہیں آتا
اجل خفا ہے فلک منتقم نہیں دشمن
مرا جہان میں کوئی نظر نہیں آتا
ابھی سے کیا کریں دعویٔ شاعری تسلیم
یہ کام وہ ہے کہ جو عمر بھر نہیں آتا

مولوی الطاف حسین حالیؔ

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا
اک بندۂ نافرماں ہے حمد سرا تیرا
گو سب سے مقدم ہے حق تیرا ادا کرنا
بندے سے مگر ہوگا حق کیونکر ادا تیرا
محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے نامحرم
کچھ کہہ نہ سکا جس پر یاں بھید کھلا تیرا
جچتا نہیں نظروں میں یاں خلعت سلطانی
کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا
عظمت تری مانے بن کچھ بن نہیں آتی
ہیں خیرہ و سرکش بھی دم بھرتے سدا تیرا
تو ہی نظر آتا ہے ہر شے پہ محیط ان کو
جو رنج و مصیبت میں کرتے ہیں گلا تیرا
نشے میں وہ احساں کے سرشار ہیں اور بے خود
جو شکر نہیں کرتے نعمت پہ گلا تیرا
سمجھا ہے پرے تجھ کو ادراک کی سرحد سے
جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا
طاعت سے ادب تیرا عصیاں سے ہے گو بڑھ کر
عصیاں میں ہے طاعت سے اقرار سوا تیرا

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری　　گھر گھر لئے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

ہر قول ترا دل سے ٹکرا کے گزرتا ہے　　کچھ رنگ بیاں حالیؔ ہے سب سے جدا تیرا

۳

کمال جس کا ازل سے وہ ہے کمال تیرا　　باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ　　ہر دل پہ چھا رہا ہے رعب جمال تیرا

کاوش میں سب آئی دگرا میں ہے جیسی　　جو نسل ہوا نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا

گھبرائے پوچھتے ہیں گو جسم و دل بندے ہوا ہیں　　ملنے سے بھی سوا ہے پھیلا محال تیرا

گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں　　لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا

پھندے سے تیرے کیونکر جائے نکل کے کوئی　　پھیلا ہوا ہے ہر سو عالم میں جال تیرا

ان کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی　　آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جمال تیرا

دل ہو کہ جان تجھ سے کیونکر عزیز رکھیے　　دل ہے سو چیز تیری جاں ہے سو مال تیرا

ہے جو نہال سے دل اس کا قوی زیادہ　　رکھتی ہے آسرا یاں جو بے زوال تیرا

ہے پاس دوستوں کے تیری یہی نشانی　　یا رب کبھی نہ پائے زخم اندمال تیرا

یکتائی میں حالیؔ یہ رنگ آشنائی　　سن سن کے شعر سنیں ہے قال اہل حال تیرا

۳

جہاں میں حالیؔ کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجیے گا　　یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا

ہو لاکھ غیروں کا غیر کوئی نہ جاننا اس کو غیر ہرگز　　جو اپنا سایہ بھی ہو تو اس کو تصور اپنا نہ کیجیے گا

سنا ہے صوفی کا قول ہے یہ کہ ہے طریقت میں کفر دعویٰ　　یہ کسر دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجیے گا

اسی میں ہے خیر حضرت دل کہ یار بھولا ہوا ہے ہم کو　　کرے وہ یاد اس کی بھول کر بھی کبھی تمنا نہ کیجیے گا

کہے اگر کوئی تم کو واعظ کہ کہتے کچھ اور کرتے ہو کچھ　　زمانے کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اس کی پروا نہ کیجیے گا

ملا ہے تم کو حسب کمالی تمہیں ہو پیران میکدہ تو　　جو ہم پہ کچھ کیجیے گا تو آپ بے جا نہ کیجیے گا

لگاؤ تم میں اگر نہیں ہے نہ درد و الفت کی آگ زاہد
پھر اور کیا کیجئے گا آخر جو ترکِ دنیا نہ کیجئے گا

تمہارا شیوہ تھا دوستدارِ حالی اور اپنے بیگانے کا نباہ جو
سلوک اس سے کئے جو تم نے تو ہم سے کیا کیا نہ کیجئے گا

۴

نفس وعدے بے گناہی کا سدا کرتا رہا
گرچہ آتے جی سے دل اکثر گلا کرتا رہا

حق نے احساں میں کمی کی اور نہ میں نے کفراں میں کمی
وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کرتا رہا

چوریوں سے دیدہ و دل کی نہ شرمایا کبھی
چھپکے چھپکے نفسِ خائن کا کہا کرتا رہا

طاعتوں کی زد سے بچ بچ کر چلا راہِ خطا
وار اُن کا اس لئے اکثر خطا کرتا رہا

نفس میں جو ناروا خواہش ہوئی پیدا کبھی
اُسکو حیلے دل سے گھڑ گھڑ کر روا کرتا رہا

شیخ نہ دیکھیں دست بستہ پیر اگر جانیں کریں
اُن سے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا

تھا نہ استحقاق تحسین پر بھی تحسین سوا
حق سے بے سود دل ہمتی کا دعویٰ کرتا رہا

شہرتیں اپنی جس قدر پھیلتی گئیں آفاق میں
پھر نفس اتنا ہی یاں نشو و نما کرتا رہا

ایک عالم سے وفا کی تو نے اے حالی مگر
نفس پر اپنے سدا ظلم و جفا کرتا رہا

۵

بلبل و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دیگی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

فیصلہ گردشِ دوراں نے کیا ہے سو بار
مرو کس کا ہے بدخشان و ختن کس کا ہے

دم سے یوسف کے جب آباد تھا یعقوب کا گھر
چرخ کہتا تھا کہ یہ بیتِ حزن کس کا ہے

مطمئن اس سے مسلماں نہ مسیحی نہ یہود
دوست کیا جانئے یہ شیخِ کہن کس کا ہے

واعظ اک عیب سے تو پاک ہے یا ذاتِ خدا
ورنہ بے عیب زمانے میں چلن کس کا ہے

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہلِ نظر کی تجھ پر
تم میں رو ہے گل و نسرین و سمن کس کا ہے

عشق اُدھر عقل اِدھر دونوں میں چلے ہیں تیری
رستہ اب دیکھئے دونوں میں کہ رن کس کا ہے

شان دیکھی نہیں گر تو نے چمن میں اُسکی
ورنہ تجھ میں یہ ادا اے [illegible] چمن کس کا ہے

ہیں فصاحت میں مثل واعظ و حالی دونوں — دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

سیّد اکبر حسین صاحب اکبر

خوشامد کرتے ہیں غیروں کی اور آپس میں لڑتے ہیں — یونہیں بربادیاں آتی ہیں یونہیں گھر بگڑتے ہیں
بزرگوں سے عداوت دوستی بادہ فروشوں سے — اور اسپرٹ عی تہذیب کے بن کر اکڑتے ہیں
تعجب نخوتِ اہلِ زمیں پر مجکو آتا ہے — یہ اسپرٹ کیوں اکڑتے ہیں کہ جسمیں مٹی کے گڑھے ہیں
ہمارا جوش میں آنا دکھا ہی دیگا رنگ اپنا — ابھی اس میکدے میں ہم بڑے گوشے میں سڑتے ہیں
تحیر آپ کی غزلوں میں آتا ہے مجھے اکبر — بتوں پر آپ مرتے ہیں کہ شیطانوں سے لڑتے ہیں

۲

مذہب ہی سے حفاظتِ قومی ہے اے عزیز — ناداں ہے کو اڑا اٹھادے جو جڑ مول سے
اتنا ہی آدمی میں سمجھئے کمالِ فہم — جتنا کہ احتراز کرے وہ فضول سے
جو کام آئے میرے کروں اُس طرف کو رُخ — تخصیص سرد سے ہے نہ وحشت ببول سے
ہرگز اُس انجمن کو نہ سمجھے مفیدِ قوم — خالی ملے جو ذکرِ خدا و رسول سے

۳

تسکینِ دل اس بزم میں واللہ نہ پائی — چاہا تھا نکل جائیں مگر راہ نہ پائی
معنی سے معرا نظر آیا مجھے ہر نقش — آنکھوں نے کوئی صورتِ دل خواہ نہ پائی
غوّاص رہے بحرِ حقیقت کے ہمیشہ — فکرِ حکما نے بھی مگر تھاہ نہ پائی
دیکھی نہ کوئی بات سوا نام کے اس میں — کچھ لذّتِ شان و حشم و جاہ نہ پائی
بارِ دلِ پُر غم میں کمی ہوتی کچھ اس سے — فریاد کی طاقت بھی مگر آہ نہ پائی
ملت کا ادب اٹھ گیا جس قوم کے دل سے — اقبال کی سمت اس نے کبھی راہ نہ پائی

۴

مفتون ہو گئے ہم اس بے بقا چمن کے — آنکھوں میں خاک ڈالی تتلی نے پھول بن کے
ہستی کو اپنی سمجھیں بنیاد اپنی دیکھیں — اُٹھتے جو ہیں بگولے برباد ہوں گے تن کے
گو بھی بہت ہے اسمیں فریاد بیکسوں کی — ٹکڑے اڑیں گے اک دن اس گنبد کہن کے
غربت میں عمر گذری نام و نشاں نہ پوچھو — نقشے بھی ذہن میں اب باقی نہیں وطن کے
تھی نیک سعی تیری اے بادِ صبحگاہی — تجھکو کیا معطّر کلیوں نے پھول بن کے

۵

آئینہ رکھدے بہارِ غفلت افزا ہو چکی — دل سنوار اپنا جوانی خود آرا ہو چکی
خانۂ تن کی خرابی پر بھی لازم ہے نظر — زینت و آرائش قصرِ معلّےٰ ہو چکی
بیخودی کی دیکھ لذّت کرکے ترکِ آرزو — ہو چکی حدِ ہوس مشقِ تمنّا ہو چکی
حُسنِ مطلق کے تصوّر سے بھی لے ذوا ایک جام — روئے دنیا ہو چکا زلفِ چلیپا ہو چکی
چل بسے یارانِ ہمدم اُٹھ گئے پیارے عزیز — آخرت کی اب کر اکبر فکرِ دنیا ہو چکی

ترکیب بند

ترکیب بند۔ چند اشعار جسکا وزن و قافیہ یکساں ہو غزل کے طور پر لکھکر اُن کے بعد ایک شعر اُسی وزن کا ایسا لگائیں جسکا قافیہ اور ردیف جُدا ہو اِن سب کا نام بند ہے۔ اگر ایسے کئی بند جمع کریں تو اگر ہر بند کا شعر آخر وہی مکرر لایا جائے اُسکو ترجیع بند کہتے ہیں۔ اگر اخیر کا شعر ہر بند کا جداگانہ ہو تو اُسکو ترکیب بند کہتے ہیں۔ بند کے اشعار پانچ سے کم اور گیارہ سے زیادہ نہیں ہوتے۔

ایک پرندے کی فریاد

آتا ہے یاد مجھکو گذرا ہوا زمانہ — وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ
وہ ساتھ سب کے اُڑنا وہ سیر آسماں کی — وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا مل کے گانا
پتّوں کا ٹہنیوں پر وہ جھومنا خوشی میں — ٹھنڈی ہوا کے پیچھے وہ تالیاں بجانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی — اپنی خوشی سے جانا اپنی خوشی سے آنا

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم　　شبنم کا صبح آکر پھولوں کا منہ دھلانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت　　آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ
تڑپا رہی ہے مجھکو رہ رہ کے یاد اسکی　　تقدیر میں لکھا تھا پنجرے کا آب ودانہ

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں　　ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں　　میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
باغوں میں بسنے والے خوشیاں منا رہے ہیں　　میں دل جلا اکیلا دکھ میں کراہتا ہوں

آتی نہیں صدائیں ان کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

ارمان ہے یہ جی میں اڑ کر چمن کو جاؤں　　ٹہنی پہ گل کی بیٹھوں آزاد ہو کے گاؤں
پھولوں کی شاخ پر ہو ویسا ہی پھر بسیرا　　اس اجڑے گھونسلے کو پھر جا کے میں بساؤں
چگتا پھروں چمن میں دانے ذرا ذرا سے　　ساتھی جو ہیں پرانے ان سے ملوں ملاؤں

پھر دن پھریں ہمارے پھر سیر ہو وطن کی
اڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا چمن کی

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے　　دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے　　دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد جس نے رہ کر دن اپنے ہوں گزارے　　اس کو بھلا خبر کیا یہ قید کیا بلا ہے

آزاد مجھکو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

(اقبال - ایم - اے)

قطعات

قطعہ ان مجموعۂ اشعار کو کہتے ہیں جن میں فقط دوسرے مصرعوں میں قافیہ ہو۔ غزل یا قصیدے سے اگر مطلع نکال ڈالیں تو قطعہ رہ جائے گا۔ اور قطعہ کے اشعار دو سے کم نہیں ہوتے۔ زیادہ کی کوئی حد نہیں۔

میر محمد تقی میر

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو پڑ گیا	یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر	میں بھی کبھی کسی کا سرِ پر غرور تھا

میر

یاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول	گلگشت سرسری نہیں اس گلستان کا
گل یادگار چہرۂ خوباں ہے بے خبر	مرغ چمن نشاں ہے کسی خوش زبان کا

آشفتہ

وہی عالم اچھا تھا آشفتہ جس میں	وجود و عدم کا نہ رنج و محن تھا
نہ ہستی کا نام و نشاں تھا ذرا بھی	نہ ہم تھے نہ دل نہ غم جان و تن تھا
نہ خوف قیامت نہ تشویش دنیا	نہ مرگ اور نہ سودائے گور و کفن تھا
نہ سر تھا نہ شور جنوں کی یہ شورش	نہ دل تھا نہ اس کا یہ دیوانہ پن تھا
کھلی آنکھ خواب عدم سے تو دیکھا	اجل سر پہ اور رہبر گور کن تھا

نظیر اکبر آبادی

عجب سیر دیکھی نظیر اس چمن کی	ابھی وصل تھا نرگس و نسترن کا
ابھی یک دگر جمع تھے سنبل و گل	ابھی تھا ہم آغوش سرو و سمن کا
ابھی چہچہے بلبلوں کے عیاں تھے	ابھی شور تھا قمری نعرہ زن کا
گھڑی بھر کے پھر بعد دیکھا یہ عالم	کہ نام و نشاں بھی نہ تھا واں چمن کا

ناسخ

گذر ناگاہ جو میرا ہوا شہر خموشاں میں عجب نقشہ نظر آیا وہاں شاہانِ عالم کا
کہیں آئینۂ زانوِ سکندر کا شکستہ تھا کسی جانب پڑا تھا کاسۂ سر خاک میں جم کا

سوز

مقبروں میں دیکھتے ہیں اپنی ان آنکھوں سے ذُر یہ برادر یہ پدر یہ خویش یہ فرزند ہیں
تو بھی ٹھوکر مار کر چلتے ہیں رعنائی سے یار سوجھتا اتنا نہیں ہم خاک کے پیوند ہیں

سودا

اے نسیمِ سحری مہر و مروّت سے دُور بے نہایت نظر آیا یہ گلستاں مجھکو
ایک گُل کبھی مرا مانع نہ ہوا چلتے وقت خار نے بھی نہ رکھا کھینچ کے داماں مجھکو

ظفر

ناقابل ہو کہ نہ ہو تم کو سفر میں کچھ شوہ ساعتِ نیک منجم سے مگر پوچھتے ہو
ایک جب جاتے ہو دنیا سے سوئے ملکِ عدم نہ کوئی دن نہ کوئی وقت سفر پوچھتے ہو

ذوق

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ ہے بُرا خود وہی جو تجھکو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے کیوں بُرا کہنے سے تو اُسکے بُرا مانتا ہے

مومن

جب کہا میں نے کہ تم بیداد گر نا آشنا بے مروّت بے وفا بیگانۂ احباب ہو
ہنس کے فرمایا کہ میں تو خیر جو کچھ ہوں سو ہوں تم بھی تو بے چین ہو بے صبر ہو بیتاب ہو

مصحفی

خسرو کے سر پہ وہ نہ رہا تاجِ خسروی نے رہ گیا وہ چترِ فلک سا ہی جم کے ساتھ
کیسی اب اُنکی دھوپ میں جلتی ہیں تُربتیں سایے میں یاں پلے تھے جو ناز و نعم کے ساتھ

النسخ

جسم یوں رُوح سے لگا کہنے
تن سے جب ہو کے بے قرار چلی

چھوڑ کر ساتھ ایک عمر کا آج
حیف اے جانِ غمگسار چلی

تراب

مر گئے ہم اسی تفکر میں
اسی حسرت میں ہم جہاں سے گئے

وائے حسرت تراب بارِ دگر
پھر نہ آئے جو کوئی یاں سے گئے

سودا

اِک روز سیرِ گورِ غریباں کو میں گیا
یعنی وہاں بزرگوں کا اکثر مزار ہے

دیکھا تو ایک گور پہ نرگس ہے سرنگوں
پوچھا جو میں نے اُس سے تو کیوں شرمسار ہے

اُس نے کہا عزیز تو نرگس مجھے نہ جان
آنکھیں میں اُسکی ہوں کہ یہ جسکا مزار ہے

جب میں کہا کہ میری طرح سرنگوں ہے کیوں
اور اس قدر یہ کس کا تجھے انتظار ہے

تب تو یہ اسنے مجھ سے کہا سن رے بیخبر
یہ بات تو ہر اک کے اوپر آشکار ہے

عاشق تھا ایک کافر بے پیر کا یہ شخص
اب تک اُسی کا اسکے تئیں انتظار ہے

سودا مجھے یقین ہوا اب بسی کہ آہ
عاشق کو بعد مرگ کے بھی انتظار ہے

مثنویات

مثنوی۔ لغت میں مثنوی کے معنی ہیں دو دو کیا گیا۔ اصطلاح میں اُس نظم کو کہتے ہیں جسکے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں۔ اور اُسکے تمام اشعار مسلسل ہوں۔

حمدِ باری تعالیٰ

اللہ کی حمد ہے زباں پر
ہے آج دماغ آسماں پر

وصف اُسکے لکھیں جو لکھنے والے
کونین کے دو ورق ہوں کالے

دے منہ کو زباں زباں کو تقریر
پتلی کو نظر نظر کو تصویر

گردوں کو قمر قمر کو ہالہ
چشمو کو جگر جگر کو نالہ

کھانے کو دہن دہن کو کھانا
دانے کو شجر شجر کو دانا

پانی کو بھنور بھنور کو چکر
دریا کو صدف صدف کو گوہر

شب کو روز اور روز کو شب
لب کو دیے حرف حرف کو لب

آتش کو دھواں کیا دھواں سے
پانی کو رواں کیا رواں سے

پھول اس نے کھلائے کھلتے ہیں روز
دو وقت ملائے ملتے ہیں روز

ہے اس کا مقام سب کا بالا
سینے دم ہوتا ہے جانے والا

خامہ یہ تھکا کہ رک گیا ہے
سر لوح پہ رکھ کے جھک گیا ہے

(تحفۂ شوق)

مناجات

خدایا دے تو اپنے عشق کا درد
عنایت کر دل گرم و دم سرد

محبت کا دے اپنی داغ دل پر
بغیر از شمع ہے تاریک یہ گھر

خم دل میں شراب عشق بھر دے
پیالے چشم کے لبریز کر دے

تو عشق میں کر اپنے اس قدر غرق
نہ مجھ سے کفر و دیں میں ہو سکے فرق

عطا میرے تئیں کر یا الٰہی
جنوں کی مملکت کی بادشاہی

کہ ملک عقل کو میں دیکھ برباد
کروں جا کوہ اور صحرا کو آباد

رہے روشن مری یوں شمع ہستی
کروں ہر آن جوں پروانہ مستی

مجھے کر عشق کے خنجر سے دمساز
تڑپنے کی حلاوت سے خبر کر باز

زباں سے وہ سخن کر دے سرانجام
رہے محشر تلک جس سے مرا نام

بسانِ شمع یہ دل آب کر دے
گداز تن سے لذت یاب کر دے

چمن میں عشق کے یارب ہمیشہ / یہی میرا رہے تا زیست پیشہ
کرے یوں بلبلِ دل نالۂ زار / کہ جوں طوطی ہوں خوں آلودہ منقار
مجھے آتش کی دے یہ طاقت و تاب / کہ ہو جاوے سمندر رشک سے آب
تماشے ہر اک چشمِ تر دے / کہ سنگ آئینہ آپ سینہ ہووے
زباں رکھ تو میرے خامہ کو دن رات / لکھوں تا حمد تیری بعد از مناجات
تری ہی حمد اے چمن آرا کہاں ہو / اگر جوں سرو سر تا پا زباں ہو
نہ سننے کو تیری گل ہوا گوش / دہن میں سو زبان غنچہ کی خاموش
جہاں اس باغ میں آب رواں ہے / تو موج اسکی تری رطب اللساں ہے
شجر جیسے ہیں پاتیں شاخ کے ہات / زباں ہے شکر کی خاطر ہر اک بات
چمن کو دیکھ مرغان خوش آہنگ / کریں ہیں وصف سب تیرا بہر رنگ
بنو رنگ دیکھ تجھ صنعت گری کو / نظر کر نسترن اور جعفری کو
سدا پھیر پھیرے ہر اک پھول کے گرد / کیا کرتا ہے تیرے نام کا ورد
ترے ابرِ کرم سے شاخ سے حشم / بھرے ہے بلبلِ بستاں ترا دم
چراغِ شام کو ہر شب تری لو / نسیمِ صبح کو تیری تک و دو
تو تنہا خلق کی نسرین و سنبل / بنائی خلقتِ انساں بہ از گل
عطا کی جیسے مشتِ خاک کو جاں / فراواں ہے دم آب و لب ناں
رکھے ہے کام میں جب تک زباں تر / نمک گاہے چکھاوے گا وہ شکر
ہرا ہے پوششِ تن بھی بہر حال / کبھی کمبل اڑھاتا ہے کبھی شال
ہمارے واسطے اے ربِ معبود / کرم ماں باپ سے تیرا ہے افزود
ترے احساں بیاں کیا ہم سے ہوویں / رہے بیدار تو بندے جو سوویں
رکھے ہے گرم جب ہو موسمِ سرد / پڑے گرمی تو دے ہے گوشۂ سرد

رکھے ہے تجھ سے شیخ و برہمن راہ　　تری کیا ذات ہے اللہ اللہ

سخن سننے کو تو نے بخشے ہیں گوش　　سمجھنے کو دیا ہے فہم اور ہوش

زباں کی خلق منہ میں بہرِ گفتار　　کہیں تا دردِ دل آپس میں اظہار

بیاں کیا کیجئے تیری عنایت　　دیے ہیں چشم اور نورِ بصارت

کہ تا معلوم ہو شام و سحرگاہ　　چلیں پستی بلندی دیکھ کر راہ

زباں کو ذائقہ سے دی ہے تسکیں　　کیا معلوم تو نے ترش و شیریں

([illegible])

مثنوی ذوق

چاہئے نام اُسی کا اسکا خامہ　　زینتِ نامہ زیبِ سرنامہ

ہے فلک اِک نمونہ قدرت کا　　یا قلمدان ہزار صنعت کا

تختِ قرطاس کو صفائی دی　　اور سیاہی کو روشنائی دی

دیا قمری کو مصرعِ نالہ　　مصرعِ قدِ سرو پر بالا

ساقیا جلد اٹھ درنگ نہ کر　　عرصہ مطلب کا دیکھ تنگ نہ کر

طاق سے تو اتار دے شیشہ　　طاق پر رکھ کتابِ اندیشہ

شیشۂ مے کی یہ درانہ نہاں　　اور پھر یہ ستم کہ پنبہ وہاں

میں ہوں مانندِ ساغرِ لبریز　　جاں بلب - جاں بلب کو کیا پرہیز

جھوم جھوم ایسے بادل آنے لگے　　پانوں توبہ کے لڑکھڑانے لگے

کر دے یاں تک مجھے نشے میں چور　　تا کہ مانندِ خوشۂ انگور

دل کے سارے پھپھولے توڑوں میں　　نکتہ باقی کوئی نہ چھوڑوں میں

شبِ ہجراں بسر نہیں ہوتی　　نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی

بسترِ رنج و کنجِ تنہائی　　رات کیا آئی اِک بلا آئی

شام سے حال ہے یہ صبح تلک — نہیں لگتی مری پلک سے پلک
کیوں نہیں بولتے سحر کے طیور — کیا شفق نے کھلا دیا سیندور
جان بیتاب جیسے بے کل برق — وہ بھی گرم فشارہ کا برق
نبضیں چھوٹی ہوئیں غشی طاری — ایک فرقت ہزار بیماری
دل سے رخصت ہے تاب طاقت کی — بیقراری سے استقامت کی
ہوس سیر باغ ہے کس کو — دل ہے کسکو دماغ ہے کسکو
کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے گھر — سنگ دیوانہ بن گیا ہے گھر

مثنوی دریائے عشق میر تقی میر

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال — اسکی ہر اک جگہ نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں یہ درد ہوا — کہیں سینہ میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہوکے بہا — کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
کہیں رونا ہوا ندامت کا — کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا
گہ نمک اسکو داغ کا پایا — گہ پتنگا چراغ کا پایا
واں طپیدن ہوا جگر کے بیچ — یاں تبسم ہے زخم تر کے بیچ
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے — کہیں یہ خونچکاں حکایت ہے
تھا کسو دل میں نالۂ جانکاہ — ہے کسو لب پہ ناتواں اک آہ
تھا کسو کی پلک تمنا کی — ہے کسو خاطر دل کی غمناکی
کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا — کہیں موجب شکستہ رنگی کا
کہیں اندوہ جان آگہ تھا — سوزش سینہ ایک جا گہ تھا
کہیں عشاق کا نیاز ہوا — کہیں اندوہ جاں گداز ہوا

ہے کبھی دل فگار کی بیتابی تھا کسی مضطرب کی بے خوابی
کبھی چہرے کا رنگ زرد ہوا کہیں نو خط کی زرد کی گرد ہوا
کبھی پروانے کے شعلہ پیشہ رہا کبھی ستونوں میں شرار تیشہ رہا
کہیں گلزار میں لگائی آگ کہیں تیغ و تفنگ میں رکھی لاگ
کبھی التفات فروغ کشتن تھا کبھی شمشیر کا طوق گردن تھا
کبھی سینے میں جب افتادہ ہوا کہیں دل ہو کے پارہ پارہ ہوا
ایک عالم میں دردمندی کی ایک عالم میں جان سپندی کی
ایک دل تھا زخم سے ہو کر زرد ایک لب پر سخن ہے خوں آلود
اک زمانے میں دل کی خواہش تھا ایک تن میں جگر کی کاہش تھا
کہیں شیشے سے جی میں ہو کر چاہ کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ
دارِ محنت دلِ غریباں ہے مشغلہ بلا نصیباں ہے
کبھی شیون ہے اہل ماتم کا کہیں نوحہ ہے جانِ پُر غم کا
آرزو تھا امیدواروں کی دردمندی جگر فگاروں کی
تابِ زخم سینہ ریشاں ہے تکیۂ یاس مہر کیشاں ہے
حسرت آلودہ تھا کہیں شوق کی دستگاہ تھا یہ کہیں
کشش اس کی ہے ایک عجوبا ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا
کون محروم وصل یاں سے گیا کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا
عالم میں اپنے عشق یکتا ہے ہاں یہ نیرنگ ساز یکتا ہے
جس کو ہو اس کی التفات نصیب ہے وہ مہمانِ چند روز غریب
ایسی تقریب پیش لاتا ہے کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

حبِ وطن

اے سپہر بریں کے سیارو — اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا — اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری — اے شب ماہتاب تاروں بھری
اے نسیم بہار کے جھونکو — دہر ناپائدار کے دھوکو
تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز — تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز
جب وطن میں ہمارا تھا رمنا — تم سے دل باغ باغ تھا اپنا
تم مری دل لگی کے ساماں تھے — تم مرے درد دل کے درماں تھے
تم سے کٹتا تھا رنج تنہائی — تم سے پاتا تھا دل شکیبائی
آن اک اک تمہاری بھاتی تھی — جو ادا تھی وہ جی لبھاتی تھی
کرتے تھے جب تم اپنی غمخواری — دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری
جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے — ہو کے خوشحال گھر میں آتے تھے
بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لب آب — دھو کے اٹھتے تھے دل کے داغ شتاب
کوہ و صحرا و آسمان و زمیں — سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں
پر چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار — جی ہوا تم سے خود بخود بیزار
نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے — نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے
سیر گلشن ہے جی کا اک جنجال — شب مہتاب جان کو ہے وبال
کوہ و صحرا سے تا لب دریا — جس طرف جائیں جی نہیں لگتا
کیا ہوئے وہ دن اور وہ راتیں — تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں
ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور — یا تمہارے ہی کچھ بدل گئے طور
گو وہی ہم ہیں اور وہی دنیا — پر نہیں ہم کو لطف دنیا کا
اے وطن اے مرے بہشت بریں — کیا ہوئے میرے آسمان و زمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا ۔ وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
تیری دوری ہے موردِ آلام ۔ تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام
کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے ۔ گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے
مٹ گیا نقش کامرانی کا ۔ تجھ سے تھا لطف زندگانی کا
ہو گیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال ۔ تجھ بن ایک ایک پل ہے ایک ایک سال
سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے ۔ یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے
میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار ۔ یا کہ دنیا ہے تیری عاشق زار
کیا زمانے کو تو عزیز نہیں ۔ اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں
جن و انسان کی حیات ہے تو ۔ مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو
ہے نباتات کو نمو تجھ سے ۔ روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے
سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو و نما ۔ سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا
تیری اک مشت خاک کے بدلے ۔ لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا ۔ کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا
حملہ جب قوم آریہ نے کیا ۔ اور بجا ان کا ہند میں ڈنکا
ملک والے بہت سے کام آئے ۔ جو بچے وہ غلام کہلائے
شودر کہلائے راکشس کہلائے ۔ پیچ پردیس کے مگر نہ اٹھائے
گو غلامی کا لگ گیا دھبا ۔ نہ چھٹا ان سے دیس پر نہ چھٹا
قدر اے دل وطن کے رہنے کی ۔ پوچھے پردیسیوں کے جی سے کوئی
جب ملا رام چندر کو بن باس ۔ اور نکلا وطن سے ہو کے اداس
باپ کا حکم رکھ لیا سر پر ۔ پر چلا ساتھ لے کے داغ جگر
پاؤں اٹھتا تھا اس کا بن کی طرف ۔ اور کھنچتا تھا دل وطن کی طرف

گزرے غربت میں اس قدر جو سال | پر نہ بھولا اجودھیا کا خیال
دیس کو بن میں بھی جھینکتا رہا | دل میں کانٹا سا اک کھٹکتا رہا
تیر اک دل میں آ کے لگتا تھا | آتی تھی جب اجودھیا کی ہوا
کٹتے چودہ برس ہوئے تھے محال | گویا ایک ایک جُگ تھا ایک ایک سال
ہوئے یثرب کی سمت جب راہی | سیدِ ابطحی کے ہمراہی
رشتے الفت کے سارے توڑ چلے | اور بالکل وطن کو چھوڑ چلے
گو وطن سے چلے تھے ہو کے خفا | پر وطن میں تھا سب بلا ہی انکا
دل لگی کے بہت ملے ساماں | پر نہ بھولے وطن کے ریگستاں
دل میں آٹھوں پہر کھٹکتے تھے | سنگریزے زمینِ بطحا کے
گھر جفاؤں سے جن کی چھوٹا تھا | دل سے رشتہ نہ اُن کا ٹوٹا تھا
ہوئیں یوسف کی سختیاں جب دور | اور ہوا مُلکِ مصر پر مامور
مصر میں چار سُو تھا حکم رواں | آنکھ تھی جانبِ وطن نگراں
یادِ کنعاں جب اُس کو آتی تھی | سلطنت ساری بھول جاتی تھی
دُکھ اُٹھائے تھے جو وطن میں سخت | ہیچ بھاتا تھا اُس بغیر نہ تخت
جن سے دیکھی تھی سخت بے مہری | تو تھی اُن بھائیوں کی دل کو لگی
ہم بھی جب تب وطن میں گو ہیں غرق | ہم میں اور اُن میں ہے مگر یہ فرق
ہم ہیں نام وطن کے دیوانے | وہ تھے اہلِ وطن کے پروانے
جس نے یوسف کی داستاں ہے سُنی | جانتا ہوگا رُوداد اُسکی
مصر میں تھا جب پڑا آکر | اور ہوئی قوم بھوک سے مضطر
کر دیا اُن پہ وقف بیت المال | لب تک آنے دیا نہ حرفِ سوال
کھتّیاں اور کوٹھے کھول دیے | تخت سارے ذخیرے تول دیے

قافلے خالی ہاتھ آتے تھے | اور پھر تو یہاں سے جاتے تھے
یوں گئے قحط کے وہ سال گذر | جیسے بچھڑے کی ٹھوک وقت سحر
اے دل اے بندۂ وطن ہشیار | خواب غفلت سے ہو ذرا بیدار
او شراب خودی کے متوالے | گھر کی بو کمبخت کے چھٹنے والے
نام ہے کیا اسی کا حب وطن | جسکی تجھکو لگی ہوئی ہے لگن
کبھی بچوں کا دھیان آتا ہے | کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے
یاد آتا ہے اپنا شہر کبھی | تو کبھی اہل شہر کی ہے لگی
نقش ہے دل پہ کوچہ و بازار | پھرتے آنکھوں میں ہیں در و دیوار
کیا وطن کی یہی محبت ہے | یہ بھی الفت میں کوئی الفت ہے
اس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند | اس سے خالی نہیں چرند پرند
ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں | سوکھ جاتے ہیں روکھ فرقت میں
جا کے کابل میں آم کا پودا | کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا
آکے کابل سے یاں بہی و انار | ہو نہیں سکتے بار ور زنہار
مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے | ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے
آگ سے جب ہوا سمندر دور | اسکو جینے کا پھر نہیں مقدور
گھوڑے جب کھیت سے بچھڑتے ہیں | جان کے لالے انکے پڑتے ہیں
گائے یا بھینس اونٹ یا بکری | اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی
کہئے حب وطن اسی کو اگر | ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کمتر
ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد | نوع انساں کا جسکو سمجھیں فرد
جس پہ اطلاق آدمی ہو صحیح | جسکو حیوان پہ دے سکیں ترجیح
قوم پہ کوئی زد نہ دیکھ سکے | قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے

قوم سے جان تک عزیز نہ ہو　　قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو
سمجھے اُنکی خوشی کو راحتِ جاں　　واں جو نوروز ہو تو عید ہو یاں
رنج کو اُن کے سمجھے مایۂ غم　　واں اگر سوگ ہو تو یاں ماتم
بھول جائے سب اپنی قدر جلیل　　دیکھ کر بھائیوں کو خوار و ذلیل
جب پڑے اُن پہ گردشِ افلاک　　اپنی آسائشوں پہ ڈال دے خاک
بیٹھے بے فکر کیا ہو ہموطنو　　اُٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ　　ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اُٹھاؤ　　دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک　　کرو دامن سے تا گریباں چاک
کھانا کھاؤ تو جی میں تم شرماؤ　　ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ
کتنے بھائی تمہارے ہیں نادار　　زندگی سے ہے جنکا دل بیزار
نوکروں کی تمہارے جو ہے غذا　　اُن کو وہ خواب میں نہیں ملتا
جس پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو　　واں میسر نہیں وہ اوڑھنے کو
کھاؤ تو پہلے لو خبر اُنکی　　جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی
پہنو تو پہلے بھائیوں کو پنہاؤ　　کہ ہے اُترن تمہاری جنکا بناؤ
ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر　　ہے کوئی اُن میں خشک اور کوئی تر
سب کو ہے ایک اصل سے پیوند　　کوئی آزردہ ہے کوئی خرسند
مقبلو مدبروں کو یاد کرو　　خوش دلو غمزدوں کو شاد کرو
جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ　　تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ
ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر　　تو جو لی جائے کور و کر کی خبر
تم اگر ہاتھ پاؤں رکھتے ہو　　لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو

تندرستی کا شکر کیا ہے بتاؤ — رنج بیمار بھائیوں کا بٹاؤ

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ہو مسلمان اس میں یا ہندو — بدھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو

جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی — جین مت ہووے یا کہ ویشنوی

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

ملک ہیں اتفاق سے آزاد — شہر ہیں اتفاق سے آباد

ہند میں اتفاق ہوتا اگر — کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی — اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ — لگی غیروں کی تم پہ پڑنے نگاہ

پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی — جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی

پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے — ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے

کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا — کبھی درانیوں نے زر لوٹا

کبھی نادر نے قتل عام کیا — کبھی محمود نے غلام کیا

سب سے آخر کو لے گئی بازی — ایک شائستہ قوم مغرب کی

یہ بھی تم پہ خدا کا تھا انعام — کہ پڑا تم کو ایسی قوم سے کام

ورنہ دم مارنے نہ پاتے تم — پڑتی جو سر پہ وہ اٹھاتے تم

ملک روندے گئے ہیں پیروں تلے — چین کس کو ملا ہے غیروں سے

قوم کے جو تمہارے ہیں داتا — سوچو اے میرے پیارو اور دلدارو

مال و دولت کو ہے یہ استغنا — گر تمہیں بھائیوں کی کچھ پروا

گھر میں قحط کی تباہی ہے — جان عالم لبوں پہ آئی ہے

بھوک میں ہے کوئی نڈھال پڑا — موت کی مانگتا ہے کوئی دعا

بچے اک گھر میں بلبلاتے ہیں — روکے ماں باپ کو رلاتے ہیں
کوئی پھرتا ہے مانگتا در در — ہے کہیں پیٹ سے بندھا پتھر
پر جو ہیں اُن میں صاحبِ مقدور — اُن میں گنتی کے ہونگے ایسے غیور
کہ جنھیں بھائیوں کا غم ہوگا — اپنی راحت کا دھیان کم ہوگا
جتنے دیکھوگے پاؤگے بےدرد — دل کے نامرد اور نام کے مرد
عیش میں جنکے کٹتے ہیں اوقات — عید ہے دن تو شب برات ہے رات
قوم مرتی ہے بھوک سے تو مرے — کام انھیں اپنے حلوے مانڈے سے
اُن کو اب تک خبر نہیں اصلا — شہر میں بھاؤ کیا ہے غلہ کا
غلہ ارزاں ہے یا ہے دونا گراں — کال ہے شہر میں پڑا کہ سماں
کال کیا شے ہے کسکو کہتے ہیں بھوک — بھوک میں کیونکر مرتے ہیں مفلوک
سیر بھوکے کی قدر کیا سمجھے — اُسکے نزدیک سب ہیں پیٹ بھرے
اہلِ دولت کا سن چکے تم حال — اب سنو وہ جو ہیں اہلِ کمال
فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد — پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد
ہے طبیبوں میں نوک جھوک سدا — ایک سے ایک کا ہے تھوک جدا
رہتے ہیں اہلِ علم یوں اس طرح — پہلوانوں میں لاگ ہو جس طرح
عہدہ والوں کا ہے اگر جتھا — شیخو والوں میں جا نہیں سکتا
شاعروں میں بھی ہے یہی تکرار — خوشنویسوں کو ہے یہی آزار
کہ نیکوں کا کیوں ہوا نیک — دیکھ سکتا نہیں ہے ایک کو ایک
اس پہ طرہ یہ ہے کہ اہلِ ہنر — دہر سمجھے ہوئے ہیں اپنا گھر
ملی اک گانٹھ جسکو ہلدی کی — اس نے سمجھا کہ ہوں میں پنساری
نسخہ اک طب کا جسکو آتا ہے — سگے بھائی سے وہ چھپاتا ہے

جس کو آتا ہے کچھ وہ کتنا گشتہ　　ہے ہماری شرافت سے وہ ننگا
جس کو ہے کچھ دل میں معلومات　　وہ نہیں کرتا سیدھے منہ سے بات
باپ بھائی ہو یا کہ ہو بیٹا　　بھید پاتا نہیں منجم کا
کام کر دے کا جسکو ہے معلوم　　ہے زمانے میں اسکے بخل کی دھوم
الغرض جسکے پاس ہے کچھ چیز　　جان سے بھی سوا ہے اسکو عزیز
قوم پر ان کا کچھ نہیں احسان　　ان کا ہونا نہ ہونا ہے یکساں
سب کمالات اور ہنر ان کے　　قبر میں ان کے ساتھ جائینگے
قوم کیا کہہ کے ان کو روئے گی　　نام پر کیونکہ جان کھوئیگی
تربیت یافتہ جو ہیں یاں کے　　خواہ ولایت کے ہوں آئیں یا ایم اے
بھرتے حب وطن کا گو دم ہیں　　پر محبت وطن کی بہت کم ہیں
قوم کو ان سے جو امیدیں تھیں　　اب جو دیکھا تو سب غلط نکلیں
جستری اور ان کی جو گرمی　　سینت پردوں میں منہ دیے ہے پڑی
بند اس قفل میں ہے علم ان کا　　کبھی کنجی کا کچھ نہیں ہے پتا
لیتے ہیں اپنے دل ہی دل میں مزے　　گویا گونگے کا گڑ ہیں کھاتے ہوئے
کرتے پھرتے ہیں سیر گل تنہا　　کوئی پاس ان کے جا نہیں سکتا
اہل انصاف شرم کی جا ہے　　گر نہیں بخل یہ تو پھر کیا ہے
تم نے دیکھا ہے جو وہ سب کو دکھاؤ　　تم نے سیکھا جو ہے وہ سب کو سکھاؤ
یہ جو دولت تمہارے پاس ہے آج　　ہم وطن اسکے ہیں بہت محتاج
سمجھو کہ ایک ایک نے ہے نکتہ　　کہ نکلتا ہے منہ سے آپکے کیسا
آپ شائستہ ہیں تو اپنے لئے　　کچھ سلوک اپنی قوم سے بھی کئے
میز و کرسی اگر لگاتے ہیں آپ　　قوم سے پوچھئے تو ہیں بے ناپ

منشا جو تھا کہ آپ کو سب سے پہلے — قوم کو اس سے فائدہ نہ کرنا

قوم پر کرتے ہو اگر احسان — تو دکھاتے کچھ اپنا جوش نہاں

کچھ دنوں عیش میں خلل ڈالو — پیسہ جو ہے سب اُگل ڈالو

علم کو کر دو کچھ ارزاں — بیٹا نوکر نہ کرتا انگلستان

تھے ہوتے معین آہ کہیں — تھے ہوتا غیرت سے نشیں

جو ہیں دنیا میں قوم کے ہمدرد — بندہ قوم ان کے ہیں زن و مرد

باپ کی ہے دعا یہ پھر سب سے — قوم کی خیر ہو سب اولاد اسکو پیارے

ماں خدا سے یہ مانگتی ہے مراد — قوم پر سے نثار ہو اولاد

بھائی آپس میں کرتے ہیں پیمان — تو اگر مال دے تو میں دوں جان

اہل ہمت کما کے لاتے ہیں — بہت قائدے اٹھاتے ہیں

کہیں ہوتے ہیں مدرسے جاری — وطن اپنے بنتے ہیں بھاری

اور کہیں ہوتے ہیں کلب قائم — بہشت خدمت وہ سب قائم

شفاخانے کھلتے ہیں ہر جا — بنتے ہیں سیکڑوں شفاخانے

فلک میں جو مرض ہیں عام — قوم پر ان کی فرض ہے تدبیر

ہیں مدارس اور ہسپتال ہیں طبیب — کر کوئی نسخہ آتے ہیں طبیب

قوم کو پہونچے منفعت جس سے — ملک میں پھیلیں فائدے جس سے

رسم بد کا جہاں اثر پایا — حملے پر حملہ اس پہ ہونے لگا

کہیں مجلس میں ہوتی ہے تقریر — کہیں مضمون ہوتے ہیں تحریر

ایک ناٹک بنا کے لاتا ہے — دوسرا اسکو کر دکھاتا ہے

لاکھ تدبیریں جو سوجھتے ہیں — آخر اسکو مٹا کے چھوڑتے ہیں

قوم کی خاطر اٹھے ہیں سب کا کام — خواہ رات میں سفر ہو خواہ مقام

سیکڑوں گل رہے اور بہہ پائے — لاڈلے ماں کے باپ کے پیارے
جان اپنی لئے ہتیلی پر — کرتے پھرتے ہیں بحر و بر کے سفر
شوق یہ ہے کہ جان جائے تو جائے — پر کوئی بات کام کی ہاتھ آئے
جس سے مشکل ہو کوئی قوم کی حل — ملک کا آئے کوئی کام نکل
کھپ گئے کتنے بن کے جھاڑوں میں — مر گئے سیکڑوں پہاڑوں میں
لکھے جب تک جیے سفرنامے — چل دیے ہاتھ میں قلم تھامے
کو سفر میں اٹھائے رنج کمال — کر دیا پر وطن کو اپنے نہال
ہیں اب ان کے گواہ حب وطن — در و دیوار پیرس و لندن
کہئے دنیا کا جس کو باغ جنان — ہے فرانس آج یا ہے انگلستان
کام ہیں سب بشر کے ہم وطنو — تم سے کچھ ہو سکیں جو مرد بنو
چھوڑ دو افسردگی کو جوش میں آؤ — بس بہت سوئے اٹھو ہوش میں آؤ
قافلے تم سے بڑھ گئے کوسوں — رہے جاتے ہو سب سے پیچھے کیوں
قافلوں سے اگر ملا چاہو — ملک اور قوم کا بھلا چاہو
گر رہا چاہتے ہو عزت سے — بھائیوں کو نکالو ذلت سے
ان کی عزت تمہاری عزت ہے — ان کی ذلت تمہاری ذلت ہے
قوم کا مبتذل ہے جو انسان — بے حقیقت ہے گرچہ ہے سلطان
قوم دنیا میں جسکی ہے ممتاز — ہے فقیری میں بھی وہ با اعزاز
عزت قوم چاہتے ہو اگر — جا کے پھیلاؤ ان میں علم و ہنر
ذات کا فخر اور نسب کا غرور — اٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور
اب نہ سید کا افتخار صحیح — نہ برہمن کو شدر پر ترجیح
ہوئی ترکی تمام خانوں کی — کٹ گئی جڑ سے خاندانوں کی

قوم کی عزت اب ہنر سے ہے — علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دور آئے گا — بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات — یاد رکھنا ہماری آج کی بات
گر نہیں سنتے قول حالی کا — پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

موسم زمستاں

آ زمستاں کہ ہے تو بادشہ برفانی — شاہ برفانی و شاہنشہ برفستانی
تخت اقبال ہے عالم سے نرالا تیرا — اور ہے دربار سر کوہ ہمالہ تیرا
شرق تا غرب ترا ڈنکا ہے ہر طرف سفید — اڑ رہا پرچم اقبال ہے جوں برف سفید
جب کہ عالم پہ ہے تو لشکر جنگی لاتا — کوہ و صحرا کو برابر ہے الٹتا آتا
باد صرصر ہے نشاں تیرا اڑاتی آتی — فوج اقبال کو رستہ ہے بتاتی آتی
طرفۃ العین میں کر لیتا ہے تسخیر جہاں — تیرے آتے ہی بدل جاتی ہے تاثیر جہاں
جس طرف تیرے پھریرے کا ہے جھونکا جاتا — مارے ہیبت کے ہے دل سینے میں تھرا جاتا
ہے نباتات کا عالم تہ و بالا تجھ سے — پتہ پتہ ہے گلستاں کا ہلا تجھ سے
باغ پہ جب ہے ترے قہر کا جھونکا آتا — ڈر کے ہر برگ ہے پیوند زمیں ہو جاتا
تیرے سناٹے سے ہوتی ہے ہوا جان نبات — خوف کے مارے دہل جاتے ہیں مرغان نبات
تھرتھراتے ہیں کھڑے سارے جوانان چمن — منہ چھپاتے ہیں گل و سنبل و ریحان چمن
ہیں شجر سر پہ کھڑے خاک اڑاتے سارے — گل و گلزار ہیں ویراں نظر آتے سارے
نغمہ سنجان چمن پر ہیں پھلائے بیٹھے — اور پروبال میں ہیں منہ کو چھپائے بیٹھے
باغباں کا جو گلستاں میں گذر ہوتا ہے — لب حسرت سے یہی کہتا ہے اور روتا ہے
یا الٰہی وہ جوانان چمن ہو گئے کیا — باغ سنسان ہے مرغان چمن ہو گئے کیا

رنگ گل کس سے کھلے باغ میں بلبل بھی نہیں   کان میں پھونکتے آ کے جو سب نالہ گل ابھی نہیں

نہ تو غنچہ کوئی باقی ہے کہ جو منہ کھولے   نہ ہے گلزار میں سوسن جو زباں سے بولے

اور درختان چمن باغ میں عریاں کیوں ہیں   ہاتھ پھیلائے کھڑے ششدر و حیران کیوں ہیں

اے زمستاں یہ ہوئی خامہ سے جو انجبی   فی الحقیقت ہوئی خدمت میں تری بے ادبی

تجھ سے ہے دور ہواؤں کی کثافت ہوتی   دفع زہر حشراتی کی ہے آفت ہوتی

خلق سے دفع وباؤں کی ہوا ہوتی ہے   اور مریضوں کو ترے دم سے شفا ہوتی ہے

خشک ہوتی ہے مزاجوں کی رطوبت تجھ سے   پاتا ہے میوۂ شیریں میں عذوبت تجھ سے

تو نے ہے صاف جہاں آفت سے تا قاف کیا   سب شکم سیر فقیر و تہ سے شفقت کیا

مخمل و قاقم و سنجاب پہنائے تو نے   بہت اثمار تر و خشک کھلائے تو نے

تو نہ تھا جب تو نہ تھا جان کو جینے کا مزا   تھا نہ کھانے کا مزا اور نہ پینے کا مزا

اب عمل میں ترے آرام سے سب جیتے ہیں   گرم کھاتے ہیں غذا آب خنک پیتے ہیں

یا تو گرمی سے تو تھا پاس نہ کچھ بیٹھا جاتا   اور تجھ سے دل وحشت زدہ گھبرا جاتا

یا کہیں اپنے ہاتھوں کو بغلوں میں دبائے لیتے   آگ ہاتھ آئی تو ہیں دل میں چھپائے لیتے

مارے سردی کے جگر سینوں میں تھراتے ہیں   بچے ماں باپ کی بغلوں میں گھسے جاتے ہیں

ہے کوئی چھینٹ کا اوڑھے ہوئے فرغل بیٹھا   پر پھیلائے ہوئے جیسے کوئی بلبل بیٹھا

اوڑھے بیٹھا کوئی سردی سے لحاف اپنا ہے   کوئی گر بیٹھا بچھونے کو غلاف اپنا ہے

کچھ لحافوں سے ابھی منہ کو نکالے ہیں یہ   لیکن انگیٹھی کو پہلو سے سنبھالے ہیں یہ

کبھی سکڑے ہوئے بیٹھے ہیں کبھی کانپتے ہیں   ہیں کبھی کانپتے سردی سے کبھی ہانپتے ہیں

کہیں ہو ہو کہیں سی سی ہے کہیں سیٹی ہے   گرد سب بیٹھے ہیں اور بیچ میں انگیٹھی ہے

حال دیکھے ہیں جو یہ خلق کی بدحالی سے   زرد ٹھٹھرے ہوئے سردی سے کھڑے ڈالی کے

اپنے جنگل میں چھپ گئے ہیں منہ ڈھکے   پردۂ رنگ میں ہیں ڈھکے ہوئے گل بیٹھے

خلق سے گرمی و سردی کی جو ہے آگ لگی
تن تو ٹھٹھرتے ہیں سینوں میں ہے آگ لگی

ہر نفس بھاپ کے پردے میں نکلتے ہیں دھوئیں
دل میں ہے آگ لگی منہ سے اُٹھتے ہیں دھوئیں

تیرے افضال و سخاوت کے افلاک ہیں عام
یعنی سب اہلِ جہاں کے لئے پوشاک ہے عام

اہلِ دولت کو ہیں خلعت ہے دوشالے اترتے
غربا سارے ہیں کمل کے حوالے ہوتے

کر دیا تو نے ہے خلقت کو ہر اک حال میں مست
ہے کوئی کھال میں مست اور کوئی شال میں مست

شاہانِ عالم ہیں الگ بسترِ مخمل میں پڑے
فقرا لپٹے ہیں سب ایک ہی کمل میں پڑے

اے زمستاں کہوں کس طرح تری رات کا لطف
تیری شبہائے دراز اور وہ ہر رات کا لطف

کی تری رات نے داناؤں کی ہے بات بڑی
کہ کبھی دن ہیں بڑے اور کبھی رات بڑی

ہے جواں لیتا اسی شب میں جوانی کا مزا
اور جو بڈھا ہے تو لیتا ہے کہانی کا مزا

بزمِ احباب کی صحبت کا مزا ہے تجھ سے
سازِ عشرت کے لئے برگ و نوا ہے تجھ سے

صوفی و رند کے جلسے کا تو ہی ساقی ہے
مایۂ عیش و طرب دم سے ترے باقی ہے

ہر طرف ہے جو پیالی پہ پیالی اُڑتی
مے نہیں ہے یہ ہے تصویرِ خیالی اُڑتی

بے نشے مست پڑے شکرِ خدا کرتے ہیں
چائے پی پی کے ترے سر کو دعا کرتے ہیں

شبِ سرما میں اگر لطف ہے مے نوشی کا
تو اسی شب ہے مزا مجلسِ خاموشی کا

ہیں کبھی عالمِ ارواح کے مہماں آتے
بزمِ دربار میں ہیں صاحبِ فرماں آتے

دل کے ایوان میں ہیں آ کے عدالت کرتے
ہیں کتابوں کے وکیل اُنکی وکالت کرتے

جونہی اتنے میں ہے افلاک پہ تنویرِ سحر
ٹیکتا آتا ہے مشرق سے عصا پیرِ سحر

صورت وہ اپنے بکھیرے ہوئے ہے موئے سفید
ریشِ پُرنور میں ہے جلوہ نما روئے سفید

شحنۂ طور کا عالم ہے بناتا آتا
ساتھ ہے کوہِ ہمالہ کو اُٹھاتا لاتا

سبزہ کو قالینِ کشمیر بنا دیتا ہے
ملکِ تاتار کی تصویر بنا دیتا ہے

غرض ہر جا پہ ترے چلتے قوانین ہیں اور
اے زمستاں ترے اس ملک میں آئین ہیں اور

اک جھوکا جو ترے حکم کا آجاتا ہے | تو نباتات کا سب رنگ بدل جاتا ہے
زرد ہو جاتے ہیں سب دشت سے کہسار تلک | کوہ سے کاہ تلک باغ سے اشجار تلک
واں اسی فصل میں گویا نظر آتی ہے بسنت | زعفراں پوش درختوں کو بناتی ہے بسنت
عقل حیراں ہے کہ ہونا یہ بکھیڑا کس نے | آب زر زرد سے نباتات پہ چھڑکا کس نے
بعض اشجار پہ ہے حکم بہت سخت آتا | پتے پتے کو جلاتا ہوا اک لخت آتا
دل میں ہر برگ کے یوں آگ لگا دیتا ہے | جس طرح سے کوئی تانبے کو تپا دیتا ہے
ہر شجر پر ہے غرض رنگ بدل کر آتا | کہیں زر کار ہے آتا کہیں مسگر آتا
تیرے ہر حکم کے جھونکے میں ہوا تیزی ہے | کہ نباتات پہ طوفان بلا ریزی ہے
برگ دیکھو تو ہیں سب جھڑ لیے تہِ خاک پڑے | اور شجر سب ہیں برہنہ تہِ افلاک کھڑے
دفعۃً پھر سحر سانس ہے بھرتا ایسا | یا زمانے پہ وہ کچھ سحر ہے کرتا ایسا
کہ جہاں آنکھوں میں ہو جاتا ہے اک بار سفید | دشت و کہسار ہے سب تا در و دیوار سفید
ابر کی طرح بخارات کا گھر کر آنا | برف کے پردے میں وہ روئی و دھنکتے جانا
ٹکڑے ٹکڑے کبھی کڑی کے ہیں جالے اڑتے | اور ہوا میں ہیں کبھی روئی کے گالے اڑتے
جا بجا آب رواں چلنے سے ہیں تھم جاتے | اور سر چشمے ہیں شیشے کی طرح جم جاتے
جو شجر گلشن ہستی میں برہنہ تھے کھڑے | یا کہ پتوں کا بڑھائے ہوئے گہنا تھے کھڑے
شجرِ نورِ سرِ طور نظر آتے ہیں | سر بسر غیرتِ بلّور نظر آتے ہیں
ہیں زمستاں ترے سب کام زمانے سے الگ | یہ لطیفہ ہے مگر فہم میں آنے سے الگ
جام گردوں میں ہے تو شیر جماتا کیونکر | اور ہوا میں ہے طباشیر اڑاتا کیونکر
ابر باراں تو تہ چرخ بریں دیکھا تھا | پہ برستا ہوا کافور نہیں دیکھا تھا
جب کہ ہوتا ہے گزر جانبِ کہسار ترا | فن صنعت کا ہے واں اور ہی کچھ اے یار ترا
بت تراشی میں ہے تو غیرتِ فرہاد وہاں | قصر شیریں کی ہے تو ڈالتا بنیاد وہاں

اک طلسمات کا عالم ہے دکھاتا جاتا — صورتیں برف سے کیا کیا ہے بناتا جاتا

پتے پتے کا ہے تصویر میں انداز درست — اور ہر اک میوے پہ قدرت سے خدا ساز درست

اژدہا دامنِ کہسار میں سوتا ہے وہاں — برف کا اسپ سبک خیز کہیں ہوتا ہے رواں

ہے کہیں دیو کی تصویر نمودار کھڑی — اور پری ہے پرِ پرواز سے تیار کھڑی

چیتا کہتا ہے کہ میں جست ابھی کرتا ہوں — اور ہرن کہتا ہے میں چوکڑی بھر جاتا ہوں

برف کا بیل کہیں سر ہے جھکائے بیٹھا — اور کہیں اونٹ ہے گردن کو اٹھائے بیٹھا

شیرِ وابستۂ زنجیر بنا ہے دیکھو — اور کبھی فیل کی تصویر بنا ہے دیکھو

کبھی انسان کبھی حیوان بنا دیتا ہے — اور کبھی صورتِ شیطان بنا دیتا ہے

اے زمستاں جو کبھی آذر و فرہاد ہے تو — تو کبھی رشکِ دو مانی و بہزاد ہے تو

برف سے جب ہے نکھرتا فلکِ زنگاری — اور تری طبع ہے آتی سوئے رنگیں کاری

کسی صیاد کو ہے کر کے خیانت لاتا — اور کوئی صید ہے سرگشتۂ آفت لاتا

لیتا پھر کارِ تعلم ہے دمِ شمشیر سے تو — اور ہے شنگرف کو لیتا رگِ نخچیر سے تو

کی سرِ خاک جو تری برف نے سیمیں کاری — خونِ بے جرم سے کرتا ہے اسے گلناری

صید پہ تو صید کا خوں رنگ جو دکھلاتا ہے — تیر سا دیدۂ عبرت میں چبھا جاتا ہے

ہے گزر جب کہ ترا جانبِ صحرا ہوتا — اک طلسمات کا گویا ہے تماشا ہوتا

ایسا تو حکمتِ جادو سے جماتا ہے اسے — سر بسر تختۂ الماس بناتا ہے اسے

کاروانوں کی یہ راہیں ہیں قطاریں جاتیں — جس طرح دشت میں ہرنوں کی ہیں ڈاریں جاتیں

پل میں بے کشتی و پل پار اتر جاتے ہیں — شتری سیکڑوں بے لاگ گزر جاتے ہیں

تہ ہے دریا پہ گزر سہل نظر ہوتا ہے — ایسے جاتے ہیں کہ دامن نہیں تر ہوتے ہیں

گلشنِ دانش و فرہنگ ہے طلبِ فرنگ — اے زمستاں ہے وہاں تیرے ہی شیشے کا رنگ

پارے سے کہیں گلی میں اڑاتے جاتے — جلوۂ تختِ ہوادار دکھاتے جاتے

سب کو نہیں جوشِ دلی حوصلہ انگیزی میں
سب کو کمر بستہ نہیں میدانِ سبک خیزی میں
پانوں میں کانٹے کے تلووں کو چبھ جاتے ہیں کبھی
اور کبھی اپنے سر پر دھوپ چلاتے ہیں کھڑے
قدم آگے کو زبردستی کہیں نکلتے جاتے
پانو پھسل جاتے ہیں اور آگے کھسکتے جاتے
کوئی گھوڑ دوڑ میں جیتتا کوئی ہارا ہوگا
پر یہ پٹ دوڑ کا میدان تو نہ مارا ہوگا
بس کرو اے دل کہ نہیں لکھنے کی طاقت باقی
مارے سردی کے نہیں ہاتھ میں حالت باقی
دیکھو کاغذ کا ورق ہاتھ میں تھراتا ہے
اور قلم ہاتھ سے تھرا کے گرا جاتا ہے
مارے سردی کے ہے سر اپنا جھکائے لیتا
منہ ہے کاغذ کی رضائی میں چھپائے لیتا
میرے اللہ تو ہی آپ ہے بچانے والا
تیرے آزاد کو جاڑے سے پڑا ہے پالا
آرزو کچھ نہیں دنیا کی رہی ہے دل میں
اب تمنا جو ہے باقی تو یہی ہے دل میں
جوشِ عشق سے دل ہووے مرا گرم سدا
گرمیِ شعر و سخن سے رہے سینہ گرم سدا

مسدسات

مسدس - چار مصرعے ہم قافیہ اسکے بعد ایک مطلع ہوتا ہے چھ مصرعے کا ایک بند ہوا اسی طرح کے مسلسل کئی بند ہوں - مگر مطلع غیر مقررہ ہو - اس ایک بند کو مسدس کہتے ہیں۔

صبح کا سماں

وہ صبح اور وہ چھانوں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور
وہ جابجا درختوں پہ تسبیح خوانِ طیور
گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے
ٹھنڈی ہوائیں سبزۂ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریِ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ چمک

ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتّے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

قربانِ صنعتِ قلمِ آفریدگار
تھی ہر ورق پہ صنعتِ ترصیعِ آشکار
عاجز ہے فکرتِ شعرائے ہنر شعار
اِن صنعتوں کو پائے کہاں عقلِ سادہ کار

عالم تھا محو قدرتِ ربِّ عباد پر
مینا کیا تھا وادیِ مینو سواد پر

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا
دُرّاج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گل وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا
سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا

پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار

خواہاں تھے زیبِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم
کوکو کا شور نالۂ حق سرّہٗ کی دھوم
سبحان ربنا کی صدا تھی علی العموم
جاری تھے وہ جو ان کی عبادت کے تھے رسوم

کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ربِّ علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اُٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار
اے دانہ کش ضعیفوں کے رازقِ ترے نثار
یا حی یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار
تسبیح تھی کہیں کہیں تہلیلِ کردگار

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں

جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

(رنجور)

صبح کا سماں

پھاڑا جو گریبانِ شبِ آفت کو سحر نے　　پردے میں چھپایا رخِ روشن کو قمر نے
پیمانۂ خورشید لگا زر سے بھرنے　　گردوں سے سفر فوجِ کواکب لگی کرنے
تاباں جو رخِ نیرِ افلاک ہوا تھا
ذرّوں سے زر افشاں ورقِ خاک ہوا تھا

اظہار ہوئی خلعتِ شعاعی کی جو تنویر　　ڈوبے شبِ یلدائے سیاہی ہوئی تسخیر
خورشید نے کی سورۂ والشمس کی تفسیر　　والفجر کی کرتا تھا تلاوت فلکِ پیر
پھیلا ہوا تھا نورِ سحر ارض و سما میں
مصروف تھی سب خلقِ خدا یادِ خدا میں

خورشید کا وہ نورِ سحر کا وہ سپیدا　　شرحِ جعل الشمس ضیاء جو تھی ہویدا
اشجار پہ تھے زمزمۂ بلبلِ شیدا　　سرخی وہ شفق کی افقِ چرخ سے پیدا
لرزہ جو تنِ خسروِ خاور میں مگر تھا
سو مہرِ امامت پہ زوال آنے کا ڈر تھا

چمکا صفتِ شعلہ جو وہ مہرِ جہاں تاب　　شبنم کی طرح نجم کو آب ہوئی بے آب
مائل بہ سپیدی ہوا رنگِ رخِ مہتاب　　اور دیدۂ مردم سے سفر کرنے لگا خواب
طاقت نہ رہی شمع میں سوزِ جگری کی
پروانے سے رخصت تھی چراغِ سحری کی

وہ سرد ہوا صبح کی وہ نور کا عالم　　اور زمزمۂ مرغانِ خوش الحاں کے وہ باہم
وہ سبزۂ صحرا پہ پڑے گوہرِ شبنم　　اور صبح کی نوبت کی صدا آئی وہ پیہم

نالے کی جو شہنا میں صدا تھی تو بجا تھی
وہ نوبت قتل پسر شیر خدا تھی (انیس)

گھوڑے کی تعریف

جب کوند کر سمند یہاں سے وہاں گیا — ثابت ہوا نہ کچھ کدھر آیا کہاں گیا
جھاڑیں جو پتلیاں تو نظر سے نہاں گیا — گھوڑا براق بن کے سوئے آسماں گیا
غل تھا وہ آگے دیکھ لے اس باد پا کے پاؤں
دیکھے نہوں زمانے میں جس نے ہوا کے پاؤں

سرعت میں شرمسار نسیم سحر ہوئی — آنکھوں میں پھر گیا نہ مژہ کو خبر ہوئی
تن سے عرق کی بوند جو ٹپکی گہر ہوئی — جب خاک اڑی ادھر تو دم اسکی چنور ہوئی
گھوڑا نہ کہئے تخت سلیماں سوار تھا
اسکے لئے تو جنبش رگ تازیانہ تھا

باریک جلد وہ کہ خجل تھا قم و حریر — مشکیں پہ فدا ہوئے رم خوردہ شیر گیر
حلقے سے یوں نکل گیا جیسے کماں سے تیر — آتش مزاج باد پیما فلک سیر
یوں فتح ساتھ ساتھ تھی اس راہوار کے
جیسے پیادہ چلتا ہے آگے سوار کے

تلوار تھی جو ابر تو گھوڑا بھی برق تھا — مثل عروس زیور خوبی میں غرق تھا
کچھ اس میں اور ابر میں اصلا نہ فرق تھا — دو گام اس کو فاصلہ غرب و شرق تھا
پاکیزہ تھے سموں کے عرق جسم پاک پر
آئی تھی باد تند فرس بن کے خاک پر

تلوار کی تعریف

تھا صورت آئینہ تمام اسکا بدن صاف پھول آگیا تھی پر دیکھو تو فرصا نشان صاف
ناخن کبھی جوہر میں ... تھا اس کا ... تو وہ جہاں سب اگر دیکھی ان کی صفات

نااہل ہیں نامرد ہیں ناپاک ہیں اعدا
ہیں برق غضب ... ہیں خطرناک ہیں اعدا

وہ ضرب سے تیغ کاٹ کے گردن میں در آئی گردن سے سپر تک ... تھا کہ جوشن میں در آئی
جوشن سے گذرنا تھا کہ زین تک در آئی زین سے ابھی اتری تھی کہ توسن میں در آئی

بچتا کوئی کیا تیغ قضا رنگ سے بچیے
اک برق غضب کوند گئی تنگ کے نیچے

چمکا کبھی گہ خود میں سنا کر نکل آئی ٹھہری کبھی خود کبھی کھا کر نکل آئی
کاٹی جو زرہ موج میں جا کر نکل آئی منجدھار سے ڈوبا ہو ٹکا کر نکل آئی

کیا ڈر اسے طوفان کا جو چالاک ہوا ایسا
جب باڑھ پہ دریا ہو تو پیراک ہوا ایسا

دم بھر نہ ٹھہرتی تھی عجب طرح کا دم تھا تیزی پہ جب ناز تھا سر اس کا قلم تھا
ناگشت ... زہرہ افعی میں ... سم تھا تیغ کی جو یا کی تھی قد اسوا سے خم تھا

بد اصل تکبر کے سخن کہتے ہیں اکثر
جو صاحب جوہر ہیں جھکے رہتے ہیں اکثر

رباعیات

رباعی وہ ہے جس کے چاروں مصرعے ہم وزن ہم قافیہ ہوں۔ لیکن اگر تیسرا مصرعہ قافیے سے خالی ہو تو معیوب نہیں۔ رباعی کا دوسرا شعر اول سے زائد عمدہ ہونا چاہیے۔ اسکو فارسی میں ترانہ یا دوبیتی کہتے ہیں

امیر مینائیؒ

عاشق کو کہاں شکیب شیدا ہو کر — دل زندہ جاوید ہے مردا ہو کر
پیوند زمیں کرے جو مجھ کو گردوں — گرد اسکی پھرے خاک بگولا ہو کر

٢

آرام کہاں دشت میں ہم لیتے ہیں — تھمتے ہیں ٹھہرتے ہیں نہ دم لیتے ہیں
وحشت ایسی رمیدگی ہے ایسی — آنکھوں سے ہرن آگے قدم لیتے ہیں

٣

دنیا سے عدم کی سمت جاتے جاتے — بگڑے ہوئے کیا کام بناتے جاتے
آنا جانا تھا اپنا مانندِ نفس — تاخیر ذرا ہوئی نہ آتے جاتے

٤

کیا لطف اگر سارا زمانہ دیکھے — دیکھے تو نگاہِ چشمِ والا دیکھے
کر گلشنِ آفت میں گذر مثلِ نسیم — آتا دیکھے کوئی نہ جاتا دیکھے

٥

خواہانِ طرب ہے جسے ادراک نہیں — آرام تہِ گنبدِ افلاک نہیں
پیمانۂ گردوں میں کہاں بادۂ عیش — جز دُردِ تہِ جام یہاں خاک نہیں

داغ

بیگانہ یہاں ہر اک یگانہ دیکھا — اپنے مطلب کا سب زمانہ دیکھا
جس کو دیکھا غرض غرض کا اپنی — دنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا

٢

دنیا میں کب انسان کی حاجت نکلی — حسرت ہی رہی کوئی نہ حسرت نکلی
جیتے تھے قیامت کی توقع پہ ہم — خود وقت کی محتاج قیامت نکلی

انیس

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں   یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے   حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

۲

زیبا ہے وقار بادشاہی کے لئے   جرأت واجب ہے کجکلاہی کے لئے
لازم ہے کہ ہو اہل سخن تیز زباں   تلوار ضرور ہے سپاہی کے لئے

۳

پرساں کوئی کب جوہر ذاتی کا ہے   ہر گل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا   رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

۴

مانا ہم نے کہ عیب سے پاک ہے تو   مغرور نہ ہو جو اہل ادراک ہے تو
بالفرض اگر آسمان سے ہے تیرا مقام   انجام کو سوچ لے کہ پھر خاک ہے تو

۵

ویراں ہے کوئی گھر کہیں آبادی ہے   راحت سے کوئی اور کوئی فریادی ہے
اک عشرت و غم کا ہے مرقع دنیا   ماتم ہے کسی جا تو کہیں شادی ہے

۶

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے   بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا   جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

حالی

ہے وقت بگاڑ کا ہے سب سے بگاڑ   پر تجھ سے بگڑنے کا نہیں ہے یارا
ہو جائے گر ایک تو ہمارا ساتھی   پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

۲

احساں کے سبب گر بھلے کی خواہش تم کو — تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احساں نہ کرو
کرتے ہو اگر احساں تو اسے عام کرو — اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنوں نہ ہو

۳

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال — مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی — اندیشۂ فوت ہو نہ ہو خوف زوال

۴

موجود ہنر ہوں ذات میں جسکی ہزار — بدظن نہ ہو عیب اسمیں اگر ہوں دو چار
طاؤس کے پاے زشت پر کر کے نظر — کر حسن و جمال کا نہ اُس کے انکار

۵

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال — غائب ہوا تو جہاں سے واں آیا زوال
اُن پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح — جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

۶

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا — آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے — انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

سید اکبر حسین اکبر

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو — جائز ہے غباروں میں اُڑو چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد — اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

۲

آپس میں موافق رہو طاقت ہے تو یہ ہے — دیکھو نہ بہم عیب محبت ہے تو یہ ہے

صحت بھی ہو روزی بھی ہو دل کو بھی تسکیں　　دنیا میں بشر کے لئے نعمت ہے تو یہ ہے

۳

مسرت ہوئی ہنس لئے زندگی میں　　مصیبت پڑی تو دبکے چپ ہو رہے
اسی طور سے کٹ گیا روز زیست　　ستایا غضب تو رو کے سو رہے

۴

یہ دربار ہے خالق دو جہاں کا　　ادب اپنا سکہ بٹھائے ہوئے ہے
نہ سمجھو کہ حاضر نہیں حق تعالیٰ　　یہ عالم خود آنکھیں جھکائے ہوئے ہے

۵

یہی خوشیاں رہینگی دہر میں ایسے ہی غم ہونگے　　مگر اک وقت آئیگا نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے
امیدیں ٹوٹتی ہیں تو بہت صدمہ پہونچتا ہے　　امیدیں جو کریگا کم اُسے صدمے بھی کم ہونگے

۶

موت سے وحشت بشر کا اک خیال خام ہے　　اصل فطرت میں فقط آرام ہی آرام ہے
اس تجارت گاہ دنیا کا کہیں کیا تم سے حال　　کارخانے سب خدا کے ہیں ہمارا نام ہے

اعلان

کتب ذیل کی رجسٹری محکمہ سرکار عالی میں باضابطہ سنہ ۱۳۲۲ فصلی میں ہو چکی ہے کوئی صاحب اسکے چھاپنے کا قصد نہ کریں ورنہ بعوض نفع نقصان اُٹھائیں گے جس قدر جلدوں کی ضرورت ہو مطبع انوار احمدی الہ آباد سے طلب فرمائیں۔

چمن بہار اردو۔ گنجینۂ اردو۔ خزینۂ اردو۔ تفہیم القواعد۔ دستور الصرف۔ معلم الاخلاق۔ کتابی مشق نمبر ۱ و نمبر ۲

المعلن

جلال الدین احمد جعفری

ضروري اِطلاع

—:0:—

اِس کتاب کي – اور چمن زار اُردو – گنجينۂ اردو – تفهيم القواعد کي رجسٹري محکمه سرکار عالي مين سنه ۱۳۲۷ف مين باضابطه هوچکي هے – کوئی صاحب اِسکے طبع کا قصد نه فرمائيں جسقدر جلدون کي ضرورت هو منيجر مطبع سے طلب فرماوين *

آپکا خير انديش

منيجر الدار احمدي پريس

الدآباد